اہلِ عزم و ہمت

اہلِ عزم و ہمت

زیارت گاہِ ''اہلِ عزم و ہمت'' ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

علامہ محمد اقبالؒ

ناشر
ہلال پبلیکیشنز، ہلال روڈ، راولپنڈی کینٹ

جملہ حقوق بحق شعبہ تعلقاتِ عامہ افواجِ پاکستان محفوظ ہیں۔

اشاعت: اگست 2020ء

کتاب: اہلِ عزم و ہمت

ISBN نمبر: 978-969-7632-10-7

تالیف و ترتیب: شعبہ تعلقات عامہ افواجِ پاکستان، ہلال روڈ، راولپنڈی

فون: 051-9271617, 051-9272866

ای میل: executiveeditorhilal@gmail.com

قیمت: 500 روپے

مطبع: خورشید پرنٹرز، اسلام آباد

فہرست

1	حرفِ آغاز		6
2	ہم سر پہ کفن باندھ کے چلتے ہیں	شیریں حیدر	9
3	پارسل	شمع خالد	16
4	بارڈر پر عید کا چاند	حسینہ معین	21
5	وہ میرا لال۔کیپٹن ڈاکٹر شرجیل شاہد شنواری شہید	والدہ	27
6	پاک افغان سرحد سے	لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود	33
7	کیپٹن نواب زادہ جاذب رحمٰن شہید	مریم ارشاد	39
8	عظیم ماؤں کے بہادر جوان بیٹے	محمد اسلم لودھی	43
9	فخرِ بلوچستان لیفٹیننٹ میر جہانگیر خان مری	عالم زیب مری	48
10	شہادت کا تاج	محمد عمران	52
11	معرکہ گنڈ اسنگھ کا فاتح اور میاں جی	طارق سجاد اشرف	57
12	داتا نگر فارم سے میران شاہ تک	لیفٹیننٹ کرنل میر باز خان	63
13	دہشت گردی سے ایک شہری کی دلیرانہ جنگ	جبار مرزا	68
14	قربانیوں کا سفر	محمد ریحان رشید	75
15	موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر	ازکیٰ کاظمی	80
16	جان اپنی لٹا کر بھی خوش ہیں	رابعہ رحمٰن روہی	85
17	پاک فضائیہ کا راشد	خدیجہ محمود	91
18	دوارکا کے جانباز	ارمغان نعیم خان	98
19	میں نے سیکھا ہی نہیں رَن میں کبھی پسپا ہونا	محبوب حیدر سحابؔ	104
20	معرکۂ چونڈہ کے ایک ہیرو	وثیق شیخ	113

21	شاہیں کا جہاں اور!	بریگیڈیئر ذیشان فیصل خان	116
22	شہادت اُس کی تمنا تھی	محمد امجد چوہدری	121
23	وہ جو سرخرو ہوئے۔۔۔	محبوب حیدر سحابؔ	126
24	میرا فیلکن (Falcon)	خدیجہ محمود	132
25	پُراسرار بندے	طاہر محمود	136
26	ہم آگے بڑھیں گے	زیب النساء	138
27	دھرتی گواہ رہنا	سیدہ شاہدہ شاہ	142
28	لہو سے جبین وطن کو نکھارنے والے	زاہد یعقوب عامر	149
29	تیرے بیٹے تیرے جانباز چلے آتے ہیں	میجر محمد سعود علی	153

انتساب

پاکستان کے اُن تمام شہیدوں و غازیوں کے نام جنہوں نے
وَطنِ عزیز کے دفاع و سلامتی کو یقینی بنانے کے لئے بے مثال
جدوجہد اور لازوال قربانیوں کے بے شمار باب رقم کئے۔

حرفِ آغاز

قیامِ پاکستان کے اوائل ہی سے افواجِ پاکستان مُلکی سرحدوں کی حفاظت اور مِلّی خدمات کی ادائیگی میں پیش پیش رہی ہیں۔ مہاجرین کی آبادکاری کا معاملہ ہو یا 1948ء میں کشمیر کے محاذ پر ہونے والی جنگ، 1965ء میں دشمن کی جارحیت ہو یا 1971ء کی جنگ، کارگل کا معرکہ ہو یا پھر نائن الیون کے بعد شروع ہونے والی دہشت گردی کے خلاف جنگ، افواجِ پاکستان کے سپوتوں نے پاک سرزمین کی حفاظت اپنی جانوں کی پرواہ کئے بغیر یقینی بنائی ہے۔ وطنِ عزیز کے انہی بیٹوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے آج سے تقریباً سوا دو برس قبل 23 مارچ 2018ء، یومِ پاکستان کے موقع پر ملک کے لئے مختلف جنگوں اور معرکوں میں جامِ شہادت نوش فرمانے والے افسروں، جوانوں اور غازیوں کے حوالے سے شعبۂ تعلقاتِ عامہ افواجِ پاکستان نے ایک کتاب ''جنونِ رُخِ وفا'' شائع کی۔ جسے شہداء اور غازیوں کے عزیز و اقارب کے ساتھ ساتھ دیگر قارئین نے بھی بہت پسند کیا۔

اب ہلال پبلیکیشنز کی جانب سے دوسری کتاب '' اہلِ عزم و ہمت'' شائع کی جارہی ہے۔ جس میں تینوں افواج، بری، بحری، فضائیہ کے ساتھ ساتھ ایف سی، رینجرز، دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں اور پاکستان کے بہادر عوام کی بے مثال قربانیوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل ہر مضمون ایک ایسا شفاف آئینہ ہے، جس میں شہدائے وطن کے پرانوار خدّ و خال اور غازیانِ ملک و ملت کے پُرخطر حربی معرکے اور اُن سے وابستہ رشتے داروں، عزیزوں اور دوستوں کے دلوں کی کیفیت آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔ چونکہ اِن تحریروں میں کئی ایسے وقت پر

لکھی گئیں جب دہشت گردی اپنے عروج پر تھی، یا اس کے خلاف کوئی مخصوص آپریشن کیا جا رہا تھا۔ اس لئے اِن تحریروں میں آپ کو اُس وقت کے جذبات و احساسات کا عکس نظر آئے گا۔ وطن کی مٹی اور فرض کی پکار پر لبیک کہنے والوں کی یہ داستانیں پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ آپکی آنکھیں نمناک تو ہوں گی مگر اس کے ساتھ ساتھ فخر و حوصلے کے جذبات بھی مہمیز ہوں گے کیونکہ زندہ قومیں ہمیشہ اپنے شہیدوں اور غازیوں کو یاد بھی رکھتی ہیں اور خراجِ تحسین بھی پیش کرتی ہیں۔

ادارہ اِن تمام تحریر نگاروں کا شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے ارضِ پاک کے شہیدوں اور غازیوں سے متعلق اپنی تحریروں کے ذریعے وابستگی کا والہانہ اظہار کیا ہے۔ ہمیں امید ہے ''جنونِ رُخِ وفا'' کی طرح اس کتاب ''اہلِ عزم و ہمت'' کے مضامین کو بھی قارئین کی جانب سے پزیرائی حاصل ہوگی۔

میجر جنرل بابر افتخار
ڈائریکٹر جنرل
اِنٹر سروسز پبلک ریلیشنز
جنرل ہیڈکوارٹرز، راولپنڈی
14 اگست 2020ء

”بالِ جبریل“

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی
یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی
زیارت گاہِ ”اہلِ عزم وہمت“ ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازالوندی
مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

مفکرِ پاکستان شاعرِ مشرق حضرت علامہ محمد اقبالؒ

ہم سر پہ کفن باندھ کے چلتے ہیں

شیریں حیدر

''میں صدق دل سے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر حلف اٹھاتا ہوں کہ میں خلوصِ نیت سے پاکستان کا حامی اور وفادار رہوں گا۔۔۔اور یہ کہ میں پاکستان کی بری فوج میں رہ کر پاکستان کی خدمت ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ سرانجام دوں گا۔۔۔اور یہ کہ میں بری، بحری یا فضائی راستے سے جہاں بھی جانے کا حکم ملا' جاؤں گا۔۔۔اور یہ کہ میں اپنے متعین افسران کے' قانون کے مطابق دیئے گئے تمام احکامات کی تعمیل اپنی جان کو درپیش خطرات سے بے نیاز ہو کر کروں گا۔۔۔اللہ میرا حامی و ناصر ہو۔۔۔آمین!!'' میں اُس وسیع میدان کے لال انکلوژر کی تیسری رو میں اپنے بیٹے یاور کے ساتھ ایک نشست پر بیٹھی، اپنے جگر کے ٹکڑے نادر کو مائیک پر ابھرنے والی آواز کی تقلید میں۔۔۔اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ۔۔۔وطن سے محبت کا عہد کرتے ہوئے سن رہی تھی۔

چھ سال پہلے۔۔۔میں اسی میدان میں اسی طرح کی ایک نشست پر بیٹھی تھی، میرے دائیں طرف نادر اور بائیں طرف یاور تھے۔۔۔میرا بڑا لال اظفر۔۔۔اسی میدان میں اپنے جیسے خوب صورت چہروں والے نوجوانوں کے ساتھ کھڑا اسی حلف کے الفاظ دہرا رہا تھا۔اظفر میرا سب سے بڑا بیٹا، اس پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔میں سب سے اگلی قطار میں تھی، اس کی کمپنی جب پریڈ کرتی ہوئی میرے سامنے سے گزری تھی تو میری نظروں نے محبت سے اُس کا حصار کیا۔۔۔میں نے اُسے پہچان لیا، یہ میرا اور اُس کا قلبی تعلق تھا ورنہ مجھے تو سارے ہی اظفر نظر آ رہے تھے۔۔۔میرے اندر ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا، میرے پیارے کو میری ہی نظر نہ لگ جائے، میں نے اُسے نظر بھر کر دیکھا تک نہیں۔پریڈ کے بعد جب سب لوگ میس کی جانب چل دیئے تو میں بھی اپنے دونوں بیٹوں کی

ہمراہی میں میس کی طرف چل پڑی، چائے پینا بھول بھال کر میں میس کے عقبی دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی تھی، جہاں اظفر اور اس کے سارے ساتھی، ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑے ڈال رہے تھے۔۔۔ٹوپیاں سروں سے اتار کر فضا میں اچھال اچھال کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دو سال کے آزمائش بھرے معمول کے بعد اب انہیں آگے آسانی نظر آ رہی تھی، وہ ہر ہر لمحے سے محظوظ ہو رہے تھے۔۔۔ان کے چہروں کی چمک پر نظر نہ ٹھہر رہی تھی، جو کچھ بھی ان کے سامنے آ رہا تھا' اسے وہ فضا میں اچھال رہے تھے۔

ان کے سینئرز ان سے بچتے پھر رہے تھے۔ چند منٹوں کے بعد یہ ہنگامہ تھما تو سب نوجوانوں کے والدین میس سے باہر نکل کر ان کی خوشیوں میں شریک ہونے لگے، پوز بنا بنا کر تصاویر بننے لگیں، میں اس وقت خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین ماں سمجھ رہی تھی۔ اظفر مجھ سے لپٹ گیا اور میں نے اس پر بوسوں کی بارش کر دی۔ وہ اعزاز کے ساتھ اکیڈمی کی تربیت سے فارغ ہوا۔ میں اس پر جتنا بھی فخر کرتی کم تھا، اس کا باپ اس خوشی کو دیکھنے کو موجود نہ تھا، میں اس موقع پر بار بار ان کی کمی محسوس کرتی اور آنکھیں نم ہو جاتیں۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں سوار ہم گھر لوٹے۔ چند دن یوں بیتے جیسے چند گھنٹے بیت گئے ہوں، جلد ہی وہ دن آ گیا جس دن اسے اپنی یونٹ میں رپورٹ کرنا تھی، میں نے دس دن میں لوگوں سے اتنی مبارکبادیں سمیٹیں کہ دامن بھر گیا۔ میں اس کے رخصت ہونے کے دن اداس اداس سی پھر رہی تھی۔ وہ آیا اور میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ''آپ روک لیں مما تو نہیں جاتا۔'' ''ارے نہیں بیٹا'' میں نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑ ڈالیں، آنسوؤں سے چہرہ تر ہو رہا تھا، میں نے دوپٹے کے پلو سے اسے پونچھا' ''یہ تو تمہارے فرض کی پکار ہے بیٹا تمہیں جانا ہی ہوگا، میں اداس تو ہوں مگر میری اداسی تمہارے پیروں میں بیڑیاں نہیں ڈالے گی!'' میں نے اس کے گھنے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی۔ ''مما۔۔۔میں مادرِ وطن کا محافظ ہوں نا۔۔۔ اس وطن کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزتوں کا رکھوالا، بس آپ اپنی دعاؤں کے حصار میں رکھیں مجھے اور میرے سارے ساتھیوں کو!'' میرے دوپٹے کے آنسوؤں سے تر پلو کو اس نے اپنی ناک

کے قریب کیا اور گہری سانس کھینچ کر اس خوشبو کو اپنے اندر اتارا جو ممتا کے آنسوؤں کے عطر کی ہوتی ہے۔۔۔''ان آنسوؤں کی قسم مما! اس ملک کی ہر ماں کے آنسوؤں کا قرض ہے ہم پر، ہر وہ ماں جو اپنے پیاروں کی جدائی میں آنسو بہاتی ہے وہ انمول ہیں۔ ہماری پیاری سرزمین کو ماؤں کے آنسو سیراب کرتے ہیں، ہر اس جان کا قرض ہے ہم پر کہ ہمیں اپنے وطن کے دشمن کو نیست و نابود کرنا ہے۔۔۔ہمیں اس سرزمین کو اپنے لہو سے گلاب رنگ کرنا ہے، یہاں ہریالی لہرائے نہ کہ مٹی سے بارود کی بو آئے۔۔۔'' میں نے اس کے پورے وجود کو بھینچ لیا جس میں سے مجھے لال تازہ گلابوں جیسی انوکھی خوشبو آ رہی تھی،''تجھے اللہ کے حوالے کیا میرے لال۔۔۔'' میں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا، وہ روانہ ہوا اور میں دیر تک اس کے وجود کی خوشبو کو اپنے گرد محسوس کرتی رہی۔۔۔ اعزازات پانے والوں کے ناموں کا اعلان شروع ہوا تو میں چونکی، تالیوں کی گونج کی آواز سے چھ سال پہلے اسی طرح اظفر کا نام بھی پکارا گیا تھا، آج کسی معظم کے نام کا اعلان ہوا تھا۔۔۔میں نے تالیاں بجانے والوں کا ساتھ دیا۔ پاسنگ آؤٹ کی تقریب اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔تھوڑی دیر میں ہی اعلان ہونے والا تھا کہ سب لوگ میس کی طرف روانہ ہوں، میں اسی طرح نادر کو دیکھوں گی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ۔۔۔اپنے دو سالوں کے آخری دن، اس دن کو یادگار بناتے ہوئے، ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑے ڈالتے ہوئے۔آسمان چھاجوں برس رہا تھا، ماؤں کے لال بھیگ رہے تھے، ہم جہاں بیٹھے تھے وہاں بارش کے کسی قطرے کی رسائی نہ تھی مگر اس میدان میں کھڑے جوانوں کو اللہ کی رحمت بھگو رہی تھی، بادل ان کے بوسے لے رہے تھے تو بادلوں میں چھپی سورج کی کرنیں کہیں کہیں سے جھانک کر ان کی بلائیں لیتیں۔ پریڈ گراؤنڈ خالی ہوا تو سب عزیز و اقارب میس کی طرف چلے۔۔۔میں نے بھی یاور کے کہنے پر بوجھل قدموں سے اٹھ کر میس کی طرف چلنا شروع کیا، آج کے دن کی خوشیاں اپنی جگہ مگر۔۔۔ چھ سال قبل کے اس دن کی یاد سے دامن ہی نہ چھڑا پا رہی تھی۔میس میں داخل ہونے تک میرے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔میری آنکھیں نم ہو گئیں، دوپٹے کا پلو پکڑا۔۔تو اس یاد نے میرا احاطہ کر لیا، کیسے اظفر نے میرے آنسوؤں

کی خوشبو کو ایک گہری سانس سے اپنے اندر اتار لیا تھا، اسے علم تھا کہ وہ آخری بار ماں کے آنسو دیکھ رہا تھا، انہیں سونگھ رہا تھا، اس نے مادرِ وطن کی حفاظت کا حلف اٹھاتے ہی جان لیا تھا کہ مادرِ وطن اس کے لہو کا نذرانہ مانگ رہی تھی، اس کے پھولوں کو لال رنگ اور تازہ گلابوں کی خوشبو درکار تھی جسے اس کے ساتھ ساتھ اس کے کئی قریبی ساتھیوں نے پورا کیا تھا۔ میں نے میس میں قدم رکھا اور تصورات میں کہیں پیچھے چلی گئی۔۔۔ اسے گئے ہوئے تین دن ہوئے تھے، موبائل فون اس کے پاس تھا مگر پھر بھی اس نے رابطہ نہ کیا تھا، یہ بات تھی تو غیر معمولی مگر اس نے جاتے ہوئے بتایا تھا کہ جہاں اس کی یونٹ ہے وہاں عام فون کے سگنل نہیں ہوتے اس لئے رابطہ نہ ہونے پر پریشان نہ ہوں۔ فون کی ہر گھنٹی پر میں فون کی طرف لپکتی، اسی طرح ایک گھنٹی پر میں نے بھاگ کر فون اٹھایا، وہی تھا، سلام دعا کے بعد میں نے رابطہ نہ کرنے کا شکوہ کیا تو وہ ہنس دیا، ''اکیڈمی سے بھی تو کئی کئی دن تک رابطہ نہ ہوتا تھا مما۔۔۔'' ''مگر اب تو تم افسر بن گئے ہو بیٹا۔۔۔'' میں نے دل ہی دل میں کئی سورتیں پڑھ کر اس پر حصار باندھا۔ ''نوکری تو نوکری ہے نا مما۔۔۔'' وہ ہنسا، اس کی ہنسی میں چشموں کی کھنک تھی، '' کہتے ہیں نا مما کہ نوکر کیا اور نخرا کیا۔۔۔'' ''وہ تو ہے مگر یہ بھی تو کہتے ہیں۔۔۔'' میں نے اس کی بات پر ہنس کر کہا، ''فوجاں نیں تے موجاں نیں!'' ''واہ مما۔۔۔ کئی سو سال پرانی بات کی ہے آپ نے، آج کل تو یہ صرف ٹیلی وژن پر بیٹھے وہ اینکر پرسن کہتے ہیں جن کے دلوں میں وطن اور فوج کے خلاف نفرت کے بیجوں کی آبیاری ہمارے کھلے دشمن کرتے ہیں!'' ''وطن تو ان کا بھی یہی ہے نا!'' میں نے اس سے پوچھا، ''وہ کیوں اس وطن سے محبت نہیں کرتے؟'' ''ضمیر کے سوداگروں کی کوئی سرزمین نہیں ہوتی مما۔۔۔ انہیں دنیا کی کوئی زمین پناہ نہیں دیتی کیونکہ انہوں نے اپنی ماں کا سودا کیا ہوتا ہے!'' ''تم ٹھیک ہو نا میرے لال۔۔۔'' ''آپ کا لال۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رکا، جانے کیا کہنا چاہتا تھا، ''آپ ٹھیک ہیں نا مما؟'' ''میں ٹھیک ہوں۔۔۔ تم کچھ کہنے جا رہے تھے؟'' میں نے اس کے سوال بدلنے پر کچھ کھٹک محسوس کی۔ ''میرے لئے دعا کیا کریں۔۔۔ صبر کے ساتھ!'' اس نے ہنس کر کہا، ''اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو!'' ''کب آؤ گے بیٹا؟'' ماں کی ممتا

تڑپ اٹھی ”ابھی تو آیا ہوں مما۔۔۔مگر جلد آؤں گا!“ اس نے انتظار کا دیا جلا دیا، میں اس کی لو میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔فون بند ہوا تو میں کتنی ہی دیر اس کی آواز کے سحر میں گرفتار رہی۔وہ کیا کہتے کہتے رکا تھا، میں سوچتی رہی مگر کوئی سرا ہاتھ میں نہ آیا۔اس رات میں دیر تک اس کے بچپن کو یاد کرتی رہی، اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں یاد کر کر کے مسکراتی رہی، رات جاگتے سوتے گزری، فجر کی نماز کے بعد جو لیٹی، تو گہری نیند میں چلی گئی۔میں ایک وادی میں تھی جو لال گلابوں سے اٹی ہوئی تھی، ان کا رنگ اور ان کی خوشبو ایسی کہ جس کی دنیا میں کوئی مثال نہ ہو۔۔۔میرے تینوں بیٹے اور ان کے مرحوم والد میرے ہمراہ تھے، ہم خوشیوں سے بھرپور قہقہے لگا رہے تھے۔۔۔یک لخت کچھ ایسا ہوا کہ وہ سارے پھول ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے، میں نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا تو مجھے صرف یاور اور نادر نظر آئے، میں نے دونوں کو مضبوطی سے تھام لیا اور اظفر اور اس کے والد کو ہم تینوں چیخ چیخ کر بلانے لگے مگر کوئی جواب نہ آیا۔۔۔تب مجھے نظر آیا کہ اظفر کے والد اس کا ہاتھ تھامے ہم سے مخالف سمت بھاگ رہے تھے۔۔۔دھند سی چھانے لگی اور میری آنکھ کھلی تو دل میں اضطراب اور رگوں میں بے چینی تھی۔کچھ کرنے کو دل نہ چاہ رہا تھا، بچوں نے میری خاموشی کا سبب پوچھا تو میری آنکھیں چھلکنے لگیں، میرے پاس اپنی اس خاموشی کا کوئی جواز نہ تھا۔دل چاہ رہا تھا کہ اظفر سے بات کر کے اس کی خیریت پوچھوں۔۔۔مگر فون وہیں سے آسکتا تھا، ہمارے بے قرار دلوں کی بے قراری کچھ کام نہ کر سکتی تھی۔کبھی کبھار غصہ بھی آتا کہ ایسی بھی کیا نوکری کہ۔۔۔مگر پھر اس کے الفاظ یاد آتے کہ جب زندگی مادرِ وطن کو دان کر دی تو کیا غم! مجھے ہمیشہ صبر کا کہتا ہے، ماں کے دل کو صبر اور قرار تو تبھی آتا ہے جب اسے اپنی اولاد نظر آئے یا کم از کم اس کی آواز سنائی دے۔اسی شام ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تسبیح پڑھتے ہوئے اظفر کو ہی یاد کر رہی تھی جب فون کی گھنٹی بجی تھی، یاور نے نمبر دیکھ کر کہا تھا، ”بھائی جان کی کال ہے مما۔۔۔آپ کا انتظار ختم ہو گیا!!!“ جانے کیسے عجیب سے الفاظ تھے کہ میرا دل دھڑک اٹھا، میں نے بے تابی سے فون لے لیا اور۔۔۔”ہیلو میری جان!“ جواب میں طویل خاموشی۔۔۔میرا دماغ سن ہو گیا، ”اظفر میری جان۔۔۔میرے بچے۔۔۔“ ”آپ ٹھیک

ہیں اماں ۔۔۔‘‘ بھاری مردانہ آواز نے سوال کیا۔’’ میں ٹھیک ہوں بیٹا، آپ کون ہیں؟‘‘ میں نے بے تابی سے سوال کیا۔۔۔’’اظفر کہاں ہے۔۔۔‘‘’’میں اظفر کا سی او ہوں جی، اپنے دوسرے بیٹے سے بات کروادیں اماں!‘‘ اس بھاری آواز نے کہا۔’’ مجھے بتائیں آپ بیٹا۔۔۔‘‘ میں نے حوصلے سے کہا،’’میری جان کا کیا حال ہے؟‘‘’’ آپ کی جان وطن پر قربان ہوگئی ہے اماں۔۔۔آپ ایک عظیم ماں ہیں اماں۔۔۔ایک شہید کی ماں!‘‘ جواب میں میری آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک نہ تھمنے والی قطار جاری ہوگئی۔۔۔’’ آپ کو مبارک ہو اماں۔۔۔‘‘ وہ آواز بھی بھرائی ہوئی تھی، نادر اور یاور بھاگ کر میرے پاس آئے، ایک نے فون کا چونگا پکڑ لیا۔۔۔’’میرے اللہ۔۔۔میرا تحفہ قبول کرنا۔۔۔‘‘ دل دھاڑیں مار مار رو رہا تھا، آنکھیں سمندر بہا رہی تھیں مگر آواز نہ نکلی، میں خاموشی سے بیٹے کی جدائی کو اپنے وجود کی گہرائیوں میں جذب کرتی رہی۔۔۔ چھ برس سے میرا بیٹا، زندہ ہی میرے وجود کی گہرائی میں سو رہا ہے، وہ سانس بھی لیتا ہے میرے اندر، کھیلتا بھی ہے، اس کی جدائی کا درد انگڑائیاں لے لے کر میرے اندر بیدار ہوتا ہے، جب نادر نے فوج میں جانے کا کہا تو میرے زخموں سے خون رسنے لگا مگر نادر مجھ سے لپٹ گیا۔۔۔’’مما!! آپ اتنے عظیم شہید کی ماں ہو کر بھی ایسا سوچتی ہیں، اگر میں شہید نہ ہوا تو اپنے وقت پر کسی نہ کسی طرح مر ہی جاؤں گا نا!‘‘ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا،’’یوں نہ کہو بیٹا۔۔۔اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو، جاؤ میں نے تمہیں بھی اللہ کو سونپا۔۔۔‘‘میرا بیٹا اپنی یونیفارم میں میرے سامنے کھڑا ہے۔۔۔اس نے مجھے مسکرا کر سلیوٹ کیا ہے، میں نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا ہے۔۔۔دس دن کے بعد وہ اپنی یونٹ میں چلا جائے گا، وہی یونٹ جس میں اس کے بھائی کا نام سنہری حرفوں سے لکھا ہوا ہے‘ شاید کوئی دن آئے گا، میں بے تابی سے نادر کی کال کا انتظار کروں رہی ہوں گی۔۔۔کوئی کال آئے گی اور مجھے بتایا جائے گا۔۔۔آہ!!!! میرے اللہ، میرے بیٹے، تیری دی ہوئی امانتیں ہیں، تیرے ہی حوالے، تیرے ہی نام پر اپنی ماؤں‘ بہنوں اور بیٹیوں کی عزتوں کے رکھوالے۔ مجھے صبر اور ہمت دے۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ میرے تیسرے بیٹے کو بھی اپنے وطن سے عشق، ایک دن اسی جگہ لے کر

آئے گا۔ اپنے سیکڑوں ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہو کر پورے جوش اور جذبے کے ساتھ کہہ رہا ہوگا۔۔۔

''میں صدق دل سے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر حلف اٹھاتا ہوں۔۔۔

پارسل

شمع خالد

میں وہیل چیئر پر بیٹھی ڈرائنگ روم میں سجی ایک سورڈ آف آنر کو دیکھ رہی تھی جو میرے سُسر کو ملی تھی۔ میرے سُسر، جب پاکستان بنا تو آرمی میں کپتان تھے۔ پاک آرمی میں انہوں نے میجر تک ترقی کی اور پھر انہیں ایک جان لیوا بیماری ایسی چمٹی کہ وہ ساری عمر معذور رہے۔ وہ ایک سچے اور کھرے پاکستانی فوجی تھے۔ ان دنوں ٹی وی نشریات محدود وقت کے لئے نشر ہوا کرتی تھیں۔ جب نشریات کا اختتام ہوتا تو قومی ترانہ بجتے ہوئے قومی پرچم لہرایا جاتا تو وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے پوتوں کو حکم دیتے کہ تم تینوں کھڑے ہو جاؤ۔ اس وقت میرے تین بیٹے تھے اور وہ سیلوٹ کے انداز میں کھڑے ہو کر ترانہ سنتے اور پرچم کو سلام کرتے۔ بچوں کے پرائمری پاس کرنے کے بعد اعلان کیا کہ میں اپنا ورثہ آج اپنے پوتوں کی کامیابی کی خوشی میں تحفے کی صورت میں دے رہا ہوں۔ انہوں نے اپنی دُوربین میرے بڑے بیٹے عامر کو دی اور ساتھ ہی اپنا کوڈک کیمرہ، جو آٹومیٹک تصویر کھینچتا تھا وہ، بھی عامر کو دے دیا۔ فیصل کے حصے میں یہ سورڈ آف آنر اور کچھ میڈلز اور ایک بندوق آئی اور اسے پیار کرتے ہوئے انہوں نے کہا یہ میرے فوجی بیٹے کے لئے ہیں۔ جب فیصل پی ایم اے میں جانے کے لئے تیار ہوا تو اس سے پوچھا گیا کہ آپ فوج کیوں جائن کرنا چاہتے ہو تو اس نے وثوق کے ساتھ کہا میرے دادا ابو میرے آئیڈیل تھے اور وہ مجھے ہمیشہ فوجی کہا کرتے تھے۔ میں ان کا یہ خواب پورا کرنے کے لئے فوج میں آیا ہوں۔ میں نے ان میڈلز کی طرف دیکھا جنہیں فیصل نے فریم کروا کے سورڈ آف آنر کے ساتھ ہی سجایا ہوا تھا۔ میں نے اپنی نوکرانی سے کہا کہ میری وہیل چیئر کو باہر لے چلو۔ باہر بہت خوبصورت دھوپ نکلی ہوئی تھی اور میرا

ہرا بھرا لان میری محنت کی گواہی دے رہا تھا۔

میری جب شادی ہوئی تو میں انیس برس کی اور خالد اکیس برس کے تھے۔ بی ایس سی کرنے کے بعد خالد نے بینک جوائن کرلیا۔ جب کہ میں میٹرک میں ڈبل پروموٹ ہونے کے بعد ایف اے کا امتحان دے کر آئی تھی۔ خالد نے مجھے بی اے میں داخل کروادیا اور ہم میاں بیوی گھر چلانے کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ خالد نے بینک میں نوکری کرنے کے ساتھ ساتھ شام کو پنجاب یونیورسٹی میں ایم پی اے (پبلک ایڈمنسٹریشن) میں داخلہ لے لیا اور مجھے لاہور کالج فار وومین میں بی اے میں داخل کروادیا اور یوں جب میں نے بی اے پاس کیا تو وہ ایم اے کر چکے تھے اور ساتھ ہی بینک میں منیجر بھی بن چکے تھے۔ اسی دوران ان کی ٹرانسفر حیدرآباد میں ہوگئی۔ جب ہم حیدرآباد پہنچے تو عامر دو سال کا اور فیصل تین مہینے کا تھا۔ یوں ہماری عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ میں گھر گرہستی کے ساتھ ساتھ اخبارات اور رسائل میں لکھتی رہی اور خالد بینک کے ساتھ لاء کرنے لگے۔ جب ان کی لاء کی ڈگری مکمل ہوئی تو وہی کتابیں میرے حصے میں آئیں۔ حیدرآباد سے اس وقت ٹرانسفر ہونے کے بعد ہم ماشاء اللہ پانچ بچوں کے والدین بن چکے تھے۔ اب ہمارے درمیان ایک عجب سا مقابلہ تھا۔ خالد کتابیں خریدتے، ایم اے کرتے، اور دوسری طرف میرا داخلہ بھجوادیتے۔ یوں میں نے تین ایم اے کر لئے اور ساتھ ہی لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان دنوں میں ریڈیو میں فوجی بھائیوں کا پروگرام پروڈیوس کرتی تھی اور اخبارات اور رسائل کے لئے بھی لکھتی تھی۔ ایک دفعہ فیصل نے بتایا کہ اس نے چوکھٹی جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ چوکھٹی جانے کا سفر میری زندگی کا ایک اور سنگِ میل تھا۔ جب ہم مظفر آباد کی حدود سے چوکھٹی کی طرف روانہ ہوئے تو ایک طرف سے دریا بہتا تھا اور دوسری طرف سے ایک چھوٹی سی سڑک ہمیں چوکھٹی لے جاتی تھی۔ فیصل ماشاء اللہ کیپٹن بن چکا تھا۔ چوکھٹی قدرت کے نظاروں سے مزین ایک ایسی خوبصورت جگہ تھی جسے میں ایک خوبصورت خواب کی طرح اپنی یادوں میں سجائے ہوئے ہوں۔ چوکھٹی کی یونٹ میں جو بورڈ لگا ہوا تھا وہ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ جس پر لکھا تھا: ہم آپ کے کل کے لئے

اپنے آج کو قربان کر رہے ہیں۔ چکوٹھی جس قدر خوبصورت تھا اتنے ہی خوبصورت اس کے بنکر اور لان تھے جہاں فوجیوں نے مختلف سبزیاں اُگا رکھی تھیں۔ حوض میں مچھلیاں تیر رہی تھی۔ سامنے پہاڑیاں تھیں۔ یونٹ کا ایک سپاہی ہمارے لئے روٹی لے کر آیا۔ ایک چنگیر میں دال اور گرم گرم روٹی تھی۔ میں نے ہمیشہ یہ سنا تھا کہ لنگر کی چنے کی دال بہت مزے دار اور کمال ہوتی ہے اور واقعی ہی وہ بہت مزیدار تھی۔ میں نے اپنا ٹیپ ریکارڈ نکالا اپنے پروگرام کے لئے ایک دستاویزی پروگرام ریکارڈ کیا اور پھر ہم نے چکوٹھی کے بارڈر سے انڈیا کی طرف جھانکا۔ دونوں سرحدوں کے درمیان ایک پُل تھا بچے وہاں بے حد خوش ہوئے کیونکہ ابھی فیصل کا چھوٹا سا بیٹا ہمارے ساتھ تھا۔ ہم ہنسی خوشی وہاں سے واپس آ گئے۔

دھوپ میں بیٹھے بیٹھے میری یاد کاریلا مانسر کیمپ کی طرف چلا گیا۔ مانسر کیمپ میں میرے بہنوئی کرنل رزاق کمانڈر تھے۔ انہوں نے پاکستان کی 1965 اور 1971 کی دونوں جنگیں لڑی تھیں۔ جب وہ اٹھ مقام پر تعینات تھے تو انہوں نے ایک عظیم فوجی کی طرح ایک ایسی سڑک بنائی جو پہاڑ سے ہوتی ہوئی نیچے آتی تھی۔ مانسر کیمپ میں بھی بھائی رزاق کمانڈر تھے اور فوجی مشقیں کروایا کرتے تھے۔ اس خوبصورت جگہ پر جا کر میں نے ایک درگاہ پر منت مانی تھی۔ یا اللہ میرے بچوں کو ایک بہتر مستقبل اور فیصل کو فوجی بنانا۔ شاید وہ قبولیت کا وقت تھا اور وہ فوج میں چلا گیا۔ اس کے فوج میں جانے کا ایک فائدہ تھا کہ میری بیوی کو ایک مشن مل گیا تھا۔ صبح شام اس کی سلامتی کی دعائیں کرنا اور اس دہشت گردی کے مسئلے کے بارے میں سوچنا جس نے ہمارے آج کو ہم سے چھین لیا تھا۔ وہ فوج جو ہمارے کل کو بچا رہی تھی اس نے ہمارے آج کے لئے اپنے آپ کو مکمل قربانی کے لئے تیار کر لیا تھا۔ دہشت گرد ہمارے بچوں تک پہنچ گئے تھے۔ وہ انسان تھے یا حیوان۔۔۔۔۔ جن کے نزدیک بچوں اور عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کو مارنا ایک کھیل تھا۔ پیارے نبیؐ ہمیشہ جنگ پر جاتے ہوئے صحابہؓ اور سپاہیوں سے یہ عہد لیا کرتے تھے کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور سبزے پر کبھی وار نہ کرنا۔ یہ کیسے دشمن تھے جنہوں نے یہ اصول ہی بھلا دیئے۔ ساتھ ہی

میرے ذہن میں ایک خوف سا آیا۔ اللہ خیر کرے فیصل کافی دنوں سے مجھ سے رابطہ نہیں کر رہا۔ جانے وہ کہاں ہے۔ کس مصروفیت میں ہے یا اللہ میرے بچے کو اور میرے تمام فوجیوں کو اپنی امان میں رکھنا۔ میرے شہروں کو جانے کس بدنظر کی نظر لگ گئی ہے کہ اب یہ بھی محفوظ نہیں۔ شہر، گاؤں، سرحدیں، ہر جگہ آگ ہی آگ جل رہی ہے۔ خدایا رحم۔۔۔ یہ ہماری قوم پر کیسا عذاب اُترا ہے کہ نہ مرنے والے کو پتا ہے نہ مارنے والے کو، نہ عمر کی قید ہے نہ جنس کی، دہشت گرد جب چاہیں جہاں چاہیں لوگوں کو بھون ڈالتے ہیں۔ ایک خودکش جیکٹ پہننے والا اپنے ساتھ پچاس ساٹھ بندوں کو لے جاتا ہے۔

پچاس ساٹھ سے اندازہ لگائیں کہ یہ پچاس ساٹھ افراد نہیں بلکہ پچاس ساٹھ گھرانے ہیں جو زخمی یا شہیدوں کے وارث ہو جاتے ہیں۔ جو نہ زندوں میں رہتے ہیں نہ مُردوں میں، اگرچہ اب حالات بہت بہتر ہو چکے ہیں۔ اب ملک پر دہشت گردی کا منحوس سایہ کم ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ وطن دشمن جانے کب سر اٹھالیں کوئی نہیں جانتا۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے آنکھیں بند کیں اور میرے سامنے بے شمار ایسے خط تبصرے اور مضامین آ گئے جس میں پاک فوج کو سلامِ عقیدت پیش کیا گیا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو اس تپتی دھوپ میں دعاؤں کے سائے میں دے دیا اور جلدی جلدی وظیفہ پڑھنے لگی۔ ڈور بیل جانے کب سے بج رہی تھی کہ میری نوکرانی نے آ کر کہا۔ اماں جی باہر ڈاکیہ آیا ہے۔ یہ پیکٹ ہے وہ کہہ رہا ہے کہ آپ اس پر دستخط کر دیں۔ میں نے ڈاکئے کو بلایا اس کے سامنے دستخط کر کے ایک پیکٹ لیا۔ شاید کسی پبلشر نے مجھے کتاب بھیجی ہے۔ لیکن جب پارسل اٹھایا تو وہ بہت بھاری نہ تھا۔ میں نے نوکرانی کو کہا کہ اوپر کا گتہ پھاڑ دو۔ پارسل کے اندر سے ایک خوبصورت گفٹ نکلا۔ جی ہاں یہ پیکٹ نہیں دھوپ میں چمکتی شعاعوں کا ایک ریلا تھا جس نے میری آنکھوں کو خیرہ کر دیا اور میں ان چمکتی روشنیوں میں تھی۔ پارسل پکڑ کر دیکھا۔ میرے نام کا ایک کارڈ اس پر لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا بیگم اور جنرل راحیل کی طرف سے اور میں حیرت سے سوچ رہی تھی کہ میں نے میڈیا میں آدھی سے زیادہ زندگی گزار دی۔ صدر اور وزراء کے گھر کھانے اور مختلف تقریبات

میں جانے کے باوجود مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ پھر یہ جنرل راحیل صاحب کی طرف سے یہ شال۔ میں نے پارسل کھول کر وہ شال اوڑھی تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں ایک محفوظ پناہ گاہ میں آ گئی ہوں۔ یہ اعزاز صرف وہی ماں جان سکتی ہے جس نے اپنے بیٹے فوج میں بھیج رکھے ہیں۔ میرے بہنوئی اپنے شہید فوجیوں کے گھر جایا کرتے تھے۔ اکثر میں پوچھتی کہ بھائی جان آپ کے دوست اس دنیا میں نہیں رہے پھر بھی آپ اُن کے گھر ایسے ہی جاتے ہیں جیسے وہ آپ کے سگے رشتہ دار ہیں۔ تو وہ کہتے تم نہیں سمجھو گی۔ ہم فوجیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ موت کا رشتہ ہے اور ہمارا مشن وطن کا دفاع اور اپنے وطن میں رہنے والوں کی زندگی کی حفاظت کی ضمانت دینا ہے۔ یہ شال صرف گرم دھاگوں اور خوبصورت کڑھائی سے بنی ہوئی نہیں تھی بلکہ یہ شال استعارہ تھی ہماری قوم کی جو ہماری فوج کے شانہ بشانہ کھڑی ہے۔ اس پر بنے پھول بوٹے وہ دعائیں ہیں جو ہم جیسی مائیں ہر لمحہ مانگتی رہتی ہیں۔ پاک فوج ہی تو ہے جس نے دشمن کو سرنگوں کر دیا ہے۔ جن میں میرے بیٹے فیصل کی بھی کاوش شامل ہے۔ جنرل راحیل شریف کے ساتھ ان کی سربراہی میں دوسرے فوجی بیٹوں کی طرح میرا بیٹا بھی اس محاذ پر ہر دم تازہ دم اور نئے جذبے کے ساتھ کھڑا رہتا ہے۔ جنرل راحیل شریف نے ضربِ عضب کو کامیاب بنانے میں ان غازیوں کی ماؤں کو یہ شال کا تحفہ بھیج کر انہیں یاد دلایا ہے کہ آپ جیسی مائیں ہی قوم کی تقدیر بدل سکتی ہیں۔ آج میں بجا طور پر پاک آرمی، جنرل راحیل شریف اور اپنی فوج کے تمام سپاہیوں، فوجیوں، کو سلیوٹ کرنا چاہتی ہوں جو ضربِ عضب کو ایک خاص جذبے سے لڑ کر کامیابی کی طرف گامزن کر رہے ہیں۔ شکریہ پاک فوج کے سپاہی راحیل شریف، ایک ماں کی طرف سے یہ شال بھجوانے کا شکریہ قبول کرو۔ اللہ تم کو اپنی پناہ میں رکھے اور جس فرض کی پکار کے لئے آپ نے ضربِ عضب شروع کی ہے اس کی کامیابیاں آپ کے قدم چومیں اور ہمارے وطن کو خدا اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین!!

بارڈر پر عید کا چاند

حسینہ معین

عید کی آمد آمد تھی۔ میں اپنے بھائی کے لئے عید کا جوڑا لینے اپنی پسندیدہ دکان پر پہنچی۔ ہمارے گھر ہمیشہ سے عید کا اہتمام کچھ زیادہ ہی ہوا کرتا تھا۔ جب اماں ابا تھے تب تو ہر بچے کی پسند کے جوڑے، جوتے، ہر چیز الگ الگ الماریوں میں سجادی جاتی تھیں۔ میرے ایک بھائی کو فوج میں جانے کا بے حد شوق تھا۔ اس کا بس چلتا تو عید کے دن بھی فوجی کپڑے پہن کر پریڈ کرتا رہتا۔ لیکن بدقسمتی سے نوعمری ہی میں اس کا ایکسیڈنٹ ہوا، سر میں چوٹ آئی تھی۔ فوج میں نہیں جاسکا۔ بہت آرٹسٹک مزاج کا تھا۔ بہترین تصویریں اور سکیچ بناتا تھا۔ لیکن فوج میں نہ جانے کا غم عمر بھر رہا۔

آج کپڑے خریدتے ہوئے مجھے سعید (اپنے بھائی) کا خیال آگیا اور میں نے بچوں کی دکان سے ایک فوجی ڈریس خریدا اور ایک بچے کو دیا کہ تم پہن لینا اور بعد میں پاکستانی فوجی بننا۔ وہ اتنا خوش ہوا جیسے پتہ نہیں کتنی بڑی نعمت مل گئی ہو اُسے۔ اس عید پر وہ یقیناً وہ ڈریس پہن کر اپنے دوستوں پر رعب ڈالے گا۔

رات کو مجھے اچانک خیال آیا کہ میں فوج کے لوگوں سے اتنا ملتی ہوں مگر میں نے یہ کبھی نہیں پوچھا کہ بھلا کیا عید پر تمام فوجی جوانوں کو چھٹی ملتی ہوگی، وہ گھر جاتے ہوں گے، عید کے کپڑے پہن کر نماز کو جاتے ہوں گے؟ پھر گھر آ کر امی کے ہاتھوں سے شیر خورمہ کھاتے ہوں گے، سب لوگ عیدی دیتے ہوں گے؟ پتہ نہیں کیوں یہ فکر اتنی بڑھی کہ میں نے فوج میں اپنے جاننے والوں کو فون کرنا شروع کئے۔ ''عارف عید پر گھر آئے گا؟'' اس کی امی نے آہستہ سے کہا: ''نہیں بیٹی وہ کیسے آسکتا ہے ڈیوٹی چھوڑ کر۔ سوچو گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کر سب خوشیاں منانے چلے جائیں

تو گھر تو لُٹ جائیں۔ عارف کی ڈیوٹی مشرقی سرحد پر ہے۔ ایسے دنوں میں تو ہمارے جوانوں کو اور زیادہ الرٹ ہونا پڑتا ہے۔" اوہ" میرا دل بیٹھ سا گیا۔ حالانکہ وہ بڑی خوشی اور فخر سے کہہ رہی تھیں مگر لہجہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ ماں تو ماں ہوتی ہے۔

ایک اور دوست جن کے شوہر اور دیور فوج میں ہیں، سے پوچھا تو وہ ایک دم چپ ہوگئیں۔ پھر یونہی بہانے سے کسی بچے کو ڈانٹنے لگیں" مت شور کرو، ہاں ہاں آج بازار چلیں گے"، میں سمجھ گئی یہ الجھی ہوئی ہے۔ میں نے یونہی کہا کہ مصطفیٰ بھائی عید پر نہیں آئیں گے۔ چلو میں آجاؤں گی؟ وہ ہنس پڑی یار وہ کیسے آسکتے ہیں۔ سرحدوں کے پاسباں پاسبانی تو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کے لہجے میں تلخی بالکل نہیں تھی۔ صرف دُکھ تھا۔ میں نے ٹالنے کو کہا کہ خیر تم نے کپڑے تو زبردست بنوائے ہوں گے اُن کے لئے۔ وہ ہنستی رہیں ہاں وہ تو بنوا لئے ہیں تم کو پتا ہے ان کو عید پر ہمیشہ چکن کاری کے سفید ململ کے کرتے اچھے لگتے ہیں۔ وہی بنوائے ہیں۔ سفید تنگ پاجامہ اور سلیم شاہی چپل جس سے بھی بات کی کچھ ایسے ہی جواب ملے۔ سوائے ایک چھوٹی بہن کے جس کے ماں باپ نہیں تھے صرف ایک ہی بڑا بھائی تھا، جو فوج میں تھا۔ وہ ایک دم رو پڑی۔ میں بھائی کے بغیر عید کے کپڑے بالکل نہیں پہنوں گی۔ جب وہ آئیں گے تب پہنوں گی۔ میں نے پوچھا تم نے اُن سے بات کی؟ اس نے بتایا بس ذرا دیر کو۔ کہہ رہے تھے۔ دیکھو بھئی گھر تو سب لوگ ہی عید مناتے ہیں، ہم تو سرحد پر منا کر دیکھیں گے اور میں کوئی اکیلا تو نہیں ہوں پوری پلاٹون ہے اور کچھ لڑکوں نے گھر سے کپڑے بھی منگوا لئے ہیں۔ رات کو تاروں کی روشنی میں ان کا پروگرام ہے کہ یہیں بیٹھ کر مشاعرہ کریں گے، گانے گائیں گے۔ خوشی پر پابندی تھوڑی ہے۔ اپنا ملک ہے، اپنی سرحد ہے، اپنی عید ہے۔ پھر رات کو اپنی مُنی بہن سے بھی بات کروں گا۔ عیدی میں نے بھیج دی ہے تم کو مل جائے گی۔ وہ پھر رو پڑی۔۔۔ میں کیا کہتی، فون بند ہو گیا تھا۔

ہماری مشرقی سرحد بہت طویل ہے۔ فوج کے جوان جگہ جگہ پہرے پر کھڑے ہوں گے۔ مغربی سرحد پر بھی فوج ڈیوٹی دے رہی ہے۔ لیکن فاصلوں کے باوجود سب آپس میں رابطہ رکھتے

ہیں۔

آدھی رات تک میں یہ ساری کہانیاں جمع کرتی رہی۔ دل اتنا دکھا کہ بار بار آنکھوں میں آنسو آئے۔ غصہ بھی آرہا تھا۔ یہ کیسے پڑوسی ہیں ہمارے۔ ان کا اپنا ملک ہے۔ اپنے گھر ہیں۔ اپنی خوشیاں پھر دوسرے ملکوں پر بُری نظریں کیوں لگائے رہتے ہیں۔

دوسرے دن میں نے ایک اور دوست کو فون کیا جو مغربی سرحد پر تعینات تھا۔ مغربی سرحد کا مسئلہ تو اور بھی سمجھ نہیں آتا یہ تو ہمارے اپنے لوگ ہیں۔ آج کراچی میں ان کی تعداد لاکھوں میں ہوگی۔ گھر ہیں، کاروبار ہیں، ہم نے تو انہیں پناہ دی تھی کتنے عرصے تک ان کی پرورش کرتے رہے تھے۔ اب ان میں سے کچھ ہمارے دشمنوں سے مل گئے ہیں۔

مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ بہت اچھی طرح یاد ہے ہمارے گھر کے برابر ایک بڑی سی حویلی تھی جس میں بہت سے افغان بھائی رہا کرتے تھے۔ ہم بچے جب پارک میں کھیلنے جاتے تو اکثر یہ لوگ مل جاتے۔ بہت پیار کرتے، مزے مزے کی کہانیاں سناتے۔ جیب سے میوہ اور ٹافیاں نکال کر کھلاتے۔ کبھی کبھی اپنی حویلی میں بھی لے جاتے۔ میں، میرا بھائی، میری بہن اور ایک کزن سب وہاں جا کر بہت خوش ہوتے۔ بڑی خوبصورت چیزیں جمع کر رکھی تھیں۔ ایک طرف ایک بڑا تنور بنا تھا جس پر گز گز بھر کی لمبی روٹیاں پکاتے تھے۔ دوسری طرف دیگ میں گوشت بنتا تھا، بہت مزیدار۔ پھر دسترخوان بچھا کر کبھی کبھی ہماری دعوت کرتے۔ ہماری یہ دوستی بالکل خفیہ تھی، اماں کو پتا نہیں تھا۔ جیسے ہی اماں کو معلوم ہوا، ایسی ڈانٹ پڑی کہ آنکھوں کے آگے ستارے چمک گئے۔ اماں اُن سے ڈرتی تھیں۔ حالانکہ جب فسادات شروع ہوئے تو وہ سب ابا کے پاس آئے اور کہنے لگے: بڑے صاحب آپ بالکل بے فکر رہئے گا، اس طرف سے کسی کو قدم رکھنے کی مجال نہیں ہوگی۔ جو بھی آئے گا ہماری لاش کے اوپر سے گزر کر آئے گا اور کسی بچے کا بال بیکا نہیں ہوگا۔ ابا نے ان کا بہت شکریہ ادا کیا کہ بھائی ہمارا تو ٹرانسفر ہوگیا ہے پاکستان، ہم جا رہے ہیں۔ آپ لوگ اپنا خیال رکھئے گا۔ مگر پھر بھی وہ لوگ روز آتے۔ تسلی دیتے۔ ان کے پاس بڑی بڑی بندوقیں ہوتی

تھیں ہمارے لئے میوے کے تھیلے لاتے تھے۔ بعد میں کئی سال بعد کراچی میں ان سے ایک صاحب نے مجھے پہچان لیا۔ اتنے خوش ہو کر ملے، جیسے کوئی بڑا بھائی ملتا ہے۔ میں گھبرا گئی کہ اماں خفا ہوں گی۔ اس لئے جلدی جلدی انہیں ٹال کر گھر چلی گئی۔ مگر سوچتی ہوں کہ وہ لوگ ہمارے دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟ بڑا جی چاہتا ہے کہ ٹی وی پر جا کر انہیں یاد دلاؤں کہ آپ تو ہمارے دوست تھے، ہمیں گود میں لے کر سڑک کراس کراتے تھے ہمیں ٹافیاں اور میوے کھلاتے تھے۔ آج آپ غیروں کے کہنے میں کیوں آگئے؟ اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ مسلمان، مسلمان کے خلاف ہو جائے۔ جان لے لے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو مارتا ہے تو پوری انسانیت کو قتل کر دیتا ہے۔ ہم انسان ہیں۔ پھر مسلمان ہیں۔ یہ مذہب تو انسانی فطرت پر ہے اسے جانوروں کی فطرت پر کیوں لا رہے ہیں؟

ذرا سوچئے! عید کے دن ہمارے جوان اور افسران تپتی دھوپ میں یونیفارم پہنے سرحدوں کی حفاظت کر رہے ہوں گے اور ان کے ماں باپ، بھائی بہنیں، بچے سب کے سب گھروں میں انتظار کی اس کیفیت میں ہوں گے کہ شاید۔۔ ذرا سی دیر ہی کو وہ گھر آجائیں، شکل دکھانے کو۔ گلے لگانے کو، کتنے گھروں کی عید۔۔۔ عید نہیں رہے گی۔ کتنے دل ویران ہوں گے۔ کتنی آنکھوں میں آنسو ہوں گے۔ لیکن وہ جو سرحدوں پر کھڑے ہوں گے، ان کے ذہن میں صرف ایک خیال ہوگا۔ کوئی غیر قوم ہماری زمین پر بُری نظر نہ ڈال سکے۔ کسی میں اتنی جرأت نہ ہو کہ وہ اس لکیر کو پار کر سکے۔ ورنہ نہ وہ رہیں گے، نہ ہم رہیں گے۔ جوان ہنستے ہنستے کہتے ہیں کہ یار وطن ہے تو ہم ہیں وطن نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اور جب تک جان میں جان ہے خوشیاں منالیں۔ اس مقدس زمین کی آبرو بڑھا دیں پھر جو اللہ کو منظور ہوگا۔ اچانک وہ چپ ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کو گھر اور گھر والے یاد آتے ہیں۔ مگر کوئی ذکر نہیں کرتا۔۔ ہنس کر ٹال جاتے ہیں۔ یہ ہیں ہمارے غازی۔۔۔!

آج عید ہے ہمارے کسی جوان کی پیشانی پر شکن نہیں۔ وہ آوازیں دے دے کر اپنوں کو بھی اور دوسروں کو بھی عید مبارک کہہ رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ پشت پر کتنی ہی توپیں اور مشین

گنیں لگی ہیں کسی وقت بھی کوئی بھی جدا ہوسکتا ہے۔ ہوتا رہا ہے جیسے ایک روز قبل اچانک ہی ایک گولی آئی اور ایک جوان ہمیشہ کی نیند سوگیا۔ اس کی ماں سکتے میں ہے۔ ماں باپ تو ہر لمحہ اپنے بچوں کی خیر کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ مگر جب ان کے دروازوں پر پرچم میں لپٹے ہوئے بیٹے پہنچتے ہیں تو وہ اُف بھی نہیں کرتے۔ بیٹے کی شہادت کی بے عزتی ہوگی۔ خاموشی سے اسے گود میں لے لیتے ہیں اور شکر کرتے ہوئے خدا کے حوالے کر دیتے ہیں۔

میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اب اندازہ ہوا تو جیسے دل ٹوٹ رہا ہے، وہ بچے تو ہمارے ہی ہیں، وہ افسر تو ہمارے ہیں۔ یہ سب کچھ وہ کس کے لئے کر رہے ہیں اور ہم چین سے خوشیاں منا رہے ہیں۔ میں نے ایک دوست کو فون کیا کہ پلیز ذرا اِک چکر لگا کر آؤ دیکھو یہ جوان کیا کر رہے ہیں۔ کیا حال ہے ان کا۔

رات کو مجھے بہت بڑا سا میسج ملا جب عید کا چاند نکلا تو سرحدوں پر ہلچل مچ گئی۔ جوانوں نے آواز لگا کر ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ دعائیں مانگیں۔ ہمارے پڑوسی بھی جانتے ہیں کہ ہمارے جوان نماز بھی باری باری پڑھتے ہیں۔ ایک دستہ نماز پڑھ رہا ہوتا ہے تو دوسرا مستعد کھڑا ہوتا ہے کہ نجانے کب دشمن وار کر بیٹھے۔ یہ خوف آپ کو ہماری طرف سے کیوں نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم امن پسند ہیں۔ امن کے خواہاں ہیں۔ دوسروں کی خوشیوں کو کبھی خراب نہیں کرتے۔ کبھی بلاوجہ حملہ نہیں کرتے۔ ہاں دوسرا وار کرے تو جواب دینے سے گھبراتے بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ زندہ رہ گئے تو غازی کہلائیں گے۔ چلے گئے تو شہادت کا درجہ ملے گا۔ یہ تو ان جوانوں کو اس وقت سے معلوم ہے جب انہوں نے فوجی بننے کے لئے پہلا قدم اٹھایا تھا۔ یہاں تو بڑی مزیدار عید چل رہی ہے۔ سرحدوں پر فوجی موقع پا کر دوسرے جوانوں اور افسروں کو مبارک باد دے رہے ہیں۔ پوچھتے ہیں۔ بھائی غفور سویاں کھائی ہیں یا نہیں غفور جو چوکس کھڑا ہے ہنستا ہے ہاں بھئی خوب کھائیں۔ گاؤں سے ایک مائی نے بالٹی بھر سویاں بھجوائی تھیں۔ ہماری تو عید ہوگئی۔

پورا میسج پڑھ کر بھی میرا دل اُداس ہے۔ میں نے تاریخ پڑھی ہے۔ قبل مسیح کی جنگ میں بھی جب جنگ روکنا ہوتی تو سفید پرچم لہرایا جاتا اور دونوں طرف امن ہو جاتا۔ جب تک یہ جھنڈے درمیان میں گڑے ہوتے نہ تو تلوار چلتی نہ بندوق، نہ توپ کا دہانہ کھلتا۔ جنگ کا اصول تو اب بھی وہی ہے سفید جھنڈا امن کے لئے ہوتا ہے۔ مگر اب درندگی بڑھ گئی ہے۔ خون بہا کر خوش رہتے ہیں۔ چاہے بچے کا خون ہو، آدمی کا یا عورت کا۔ انسان کتنا بدل گیا ہے۔ کشمیر کو دیکھ لیجئے، عراق، برما، اور اُن کے علاوہ کئی دوسرے ملکوں کے نام لے لیجئے۔ خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ روز تصویریں آرہی ہیں۔

میری صرف اتنی سی استدعا ہے کہ ہر چیز کے، ہر کھیل کے، ہر بات کے کچھ اصول مقرر ہیں جو توڑے نہیں جاسکتے۔ کیا آپ کرکٹ یا بیس بال کے اصول توڑ کر جیت سکتے ہیں۔ اس طرح جنگ کے بھی اصول ہیں۔ ہمارے مذہب میں جنگ کے دوران عورتوں اور بچوں کو مارنا منع ہے۔ یہاں آپ بغیر جنگ کے بھی عورتوں اور بچوں کا خون بہا رہے ہیں۔ کب تک یہ سلسلہ چلے گا۔ کب ہم مہذب لوگوں کی طرح بیٹھ کر آپس میں فیصلے کریں گے۔ بات یہ ہے کہ آپ سارے مسلمان کشمیریوں کو مار دیجئے تب بھی کشمیر آپ کا نہیں ہوگا۔ پاکستان کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے تو کیا آپ بچ جائیں گے؟ آپ بھی تباہ ہوں گے۔

وہ میرا لال

کیپٹن ڈاکٹر شرجیل شاہد شنواری شہید کی والدہ محترمہ کے قلم سے

3 جنوری 1986 جمعہ کا مبارک دن تھا جب اللہ تعالیٰ نے مجھے ماں جیسے خوبصورت رُتبے پر فائز کیا۔ پشاور کے ساتھ ہماری بہت سی یادیں جُڑی ہوئی ہیں اس لئے یہ شہر ہمیں ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ اب پشاور کو فراموش کرنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اس خوبصورت شہر کے سی ایم ایچ میں میرے بہادر بیٹے کی ولادت ہوئی تھی اور پہلا لباس زیبِ تن کیا اور آخری لباس بھی سی ایم ایچ پشاور میں ہی پہنا اور تیار ہو کر راولپنڈی آگیا۔

میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ میں زندہ ہوں گی اور میرا بیٹا اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ میں اپنے شہزادے کے بارے میں لکھوں گی۔ میں تو بالکل ہی ایک عام سی خاتون ہوں مگر بیٹا شہید ہو کر مجھے شہید کی ماں بنا کر میرا رتبہ بلند کر گیا۔ میں چیک اپ کے لئے سی ایم ایچ راولپنڈی گئی تو کرنل ڈاکٹر صفیہ نے میرے پاؤں کے جوتے اُتارے، میری بیٹی ڈاکٹر شمیلہ ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ بیٹا آپ نے میرے جوتے اتارنے تھے۔ شمیلہ نے کہا کہ ممی یہ سب کام تو آیا وغیرہ کے ہوتے ہیں، وہ تو عزت سے، محبت سے، شہید کی ماں ہونے کے ناتے یہ کر رہی تھی اور یہ کام اتنی جلدی سے کرنل صفیہ نے کیا کہ میں اور شمیلہ خود نہ کر سکے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ واقعی کوئی میرے پاؤں کو ہاتھ لگائے۔ یہ میری فوج کے شہداء اور ان کی فیملیز کے لئے محبتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ میری پاک فوج کو سلامت رکھے اور شہداء پر، میرے پیارے شرجیل پر، اپنی خصوصی رحمتیں و برکتیں نازل فرمائے۔ آمین!

میں نے بھی اپنے بچوں کو اپنے وطن سے محبت ہی سکھائی ہے۔ یہ محبت ہی تو ہے کہ شرجیل

کی شہادت کے بعد بھی ڈاکٹر شمیلہ نے آرمی جوائن کی اور لیفٹیننٹ شموئیل بھی پاک آرمی کا حصہ ہیں۔شرجیل شاہد نے بھی آرمی پبلک سکول ویسٹریج میں ساتویں کلاس تک پڑھا۔آرمی پبلک سکول میں شرجیل زیرِتعلیم رہا' میں آج بھی اس سکول کے آگے سے گزرتی ہوں۔شرجیل پوزیشن ہولڈر تھا خصوصی طور پر کلاس تھری سے اول پوزیشن کا ہی شوقین تھا۔

شرجیل کو نجم شہید میڈل بھی ملا۔یہ میڈل صرف ایک بچے کو ملتا ہے جو اپنی کلاس میں فرسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ تمام سیکشن کے بچوں سے زیادہ مارکس لیتا ہو۔شرجیل ساتویں کلاس کے بعد کیڈٹ کالج کوہاٹ کے لئے سلیکٹ ہوگیا۔جس دن آرمی پبلک سکول میں ساتویں کلاس کا رزلٹ تھا اسی دن کیڈٹ کالج کے لئے شرجیل کا انٹرویو تھا۔شرجیل کو اس کے ابو انٹرویو کے لئے لے گئے اور میں سکول چلی گئی۔میں نے کلاس ٹیچر سے پوچھا کہ شرجیل کا رزلٹ کیسے ملے گا وہ کہنے لگی جب سب کا اناؤنس ہو جائے تو آ کر کلاس روم میں مجھ سے رزلٹ کارڈ لے لینا۔جبکہ اس سے پہلے شرجیل سٹیج پر رزلٹ وصول کرتا تھا۔

میں بھی دوسرے والدین کے ساتھ گراؤنڈ میں کھڑی تھی کہ اناؤنسمنٹ ہوئی شرجیل شاہد کلاس سیونتھ/ اے' میں بے اختیار سٹیج پر چلی گئی اور شرجیل کا رزلٹ وصول کیا۔سب نے بہت سراہا اور خوب تالیاں بجائیں۔مجھے یہ منظر بہت اچھا لگا کہ میرے بیٹے کی سال کی محنت وصول ہوگئی۔

ہماری زندگی کا مقصد ہی بچوں کی تعلیم و تربیت کرنا تھا۔شاہد صاحب نے بچوں کو اعتماد دیا اور ماں ہونے کے ناتے میں نے بہت ہی پیار اور محبت دی جیسا کہ ہر ماں کرتی ہے۔ہمارا مقصد تھا کہ تینوں بچے بہت اچھے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین اور کامیاب انسان بنیں۔ایسے مسلمان جن کے ہاتھ اور زبان سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے۔شرجیل کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی تھی وہ ایک خوش اخلاق انسان تھا۔تربیت کرنے میں مَیں کہاں تک کامیاب ہوئی' یہ تو وقت ہی بتائے گا۔میں اس اندھیرے ماحول میں اپنے حصے کا چراغ جلانا چاہتی تھی' یہ چراغ ہمارے شہداء کے خون سے روشن ہیں اور انشاءاللہ یہ چراغ کبھی نہیں بجھیں گے۔

سانحہ پشاور پر ماؤں کا تڑپنا' بے قراری سے بھاگنا سب ان آنکھوں سے یہ مناظر دیکھے۔ مجھ جیسی مائیں وہی بھی ہوتی ہیں۔شرجیل آرمی میڈیکل کالج میں پڑھ رہا تھا اور ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا۔میں ایک دن صبح اپنے گھر سے ویسٹریج جارہی تھی جب ملٹری ہاسپٹل کے قریب پہنچی تو دیکھا کہ اچانک ایک فائر بریگیڈ کی گاڑی شور مچاتی عابد مجید روڈ کی طرف گئی' میں نے بلاسوچے سمجھے اپنی گاڑی فائر بریگیڈ کی گاڑی کے پیچھے موڑ دی۔دل میں خیال آیا خدانخواستہ ہوسٹل میں آگ تو نہیں لگ گئی جب گاڑی ہوسٹل کے آگے سے گزر گئی تو میں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے گاڑی واپس موڑ لی۔

ہاؤس جاب کے دوران شرجیل کی سندھ میں فلڈ ڈیوٹی لگی تو وہ سندھ چلا گیا۔وہاں سندھ کے لوگوں کی حالت پر بہت دکھی تھا۔ہماری پاک فوج کے ڈاکٹرز وہاں خوشی خوشی چلے جاتے ہیں جہاں شاید دوسرے ڈاکٹرز جانا پسند نہ کریں۔سندھ سے شرجیل میرے لئے،بہن شمیلہ اور خالہ کی بیٹی کے لئے کانچ کی خوبصورت چوڑیاں' جن پر ہمارا نام لکھوایا تھا' تحفہ لایا۔وہ کانچ کی خوبصورت چوڑیاں ہم نے بہت سنبھال کر رکھ لی ہیں۔

شمیلہ کی پاسنگ آؤٹ پریڈ ہوگئی اور کیپٹن کا رینک لگ گیا۔ پوسٹنگ ملٹری ہاسپٹل میں ہوئی۔کیپٹن شمیلہ جوائننگ دینے سے پہلے اپنے بھائی کو پہلا سیلوٹ کر کے گئی۔میجر شاہد صاحب راولپنڈی سے باہر پوسٹنگ پر تھے۔گھر میں میرے ساتھ شرجیل نے بڑا بیٹا ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے دونوں بچوں کی تعلیم وتربیت میں میرا بہت ساتھ دیا۔میرے چھوٹے بچوں کی کامیابیوں میں شرجیل کا بہت ہاتھ تھا۔شرجیل بچپن سے ہی بہت سمجھ دار اور عقل مند تھا۔شاید اس لئے کہ اس کو اپنی چھوٹی سی زندگی میں بڑے بڑے اور زیادہ کام کرنے تھے۔

کیپٹن شمیلہ اور لیفٹیننٹ شمویئل کی یہ خواہش حسرت ہی بن گئی کہ وہ اپنے پیارے بڑے بھائی کے ساتھ یونیفارم میں فوٹوز کھنچواتے۔انسان کی کب ساری خواہشات پوری ہوتی ہیں۔ہمارا ارمان تھا' ہماری بھی خواہش تھی کہ ہم اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھتے۔اس کی شادی کرتے مگر دل

کی دل میں ہی رہ گئی۔شرجیل سے میں نے شادی کی بات کی تو یہاں بھی اس نے اپنی بہن کی شادی کو ہی فوقیت دی۔کہنے لگا کہ ممی پہلے شمیلہ کی شادی کریں گے تب تک میرا ہارڈ ایریا بھی مکمل ہو جائے گا میں بعد میں کروں گا۔اتنا فرمانبردار بچہ کہ شاہد صاحب نے پوچھا کہ اپنی کوئی پسند ہو تو بتا دو کہنے لگا یہ آپ کا کام ہے۔اتنی سی فرمائش کی کہ لڑکی سرپرسکارف لیتی ہو۔ہم اُن ماں باپ سے نہیں جو اپنی پسند بچوں پر مسلط کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اس دفعہ ہمیں حج کی سعادت نصیب فرمائی ہم نے شرجیل کا بھی حج بدل کروایا۔کیونکہ ہماری خواہش تھی کہ ہم سب فیملی اکٹھے ہی حج کرتے۔ایک تو شرجیل کے چچا نے جو سعودیہ میں ہی انجینئر ہیں،حج بدل کیا اور ایک ہم نے کسی کو پیمنٹ کر کے حج بدل کروایا۔شاہد صاحب کے ساتھ ان کے ایک روم میٹ نے شرجیل کی فوٹو دیکھی ہوئی تھی،وہ ایک دن شاہد سے کہنے لگے کہ میجر صاحب میں نے خواب میں ایک ینگ لڑکے کو دیکھا ہے جس نے احرام پہنا ہوا ہے۔وہ خواب میں کہتا ہے کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ حج کرنے آیا ہوں،وہ آپ کا بیٹا تھا۔اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ میرے بچے کا خاص طور پر حج بدل قبول فرمائے

(آمین)

میں نے سقوطِ ڈھاکہ جیسا سانحہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔میں 16 دسمبر 1971 کو کبھی نہیں بھول سکتی۔میں چھوٹی بچی تھی،اپنے ننھیال میں تھی اس دن میری نانی اماں اور دونوں خالائیں بہت غمگین تھیں اور روتی تھیں۔خالہ اس وقت ہائی سکول میں تھی وہ خود بھی کوئی زیادہ بڑی نہیں تھیں۔مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا ہوا ہے۔جس گھر میں کوئی فوت ہوتا ہے ویسا ماحول تھا مگر میت نہیں تھی۔مجھے بھوک لگی تھی مگر کسی نے نہ خود کھانا کھایا نہ مجھے دیا۔میں نے بھوکی ہونے کے باوجود شرم سے یا پھر حالات کی وجہ سے کھانا نہ مانگا۔اب سوچتی ہوں تو سمجھ آتی ہے کہ بچپن میں غم کی شدت میں 16 دسمبر کو کھانا نہ کھانے پر صبر سیکھنا تھا۔کیونکہ پھر میری زندگی میں کافی موقعے آئے کہ کھانا حلق سے اترنا مشکل ہو گیا۔سوائے غم کے گھونٹ پینے کے میں کچھ کھا نہیں سکتی تھی۔جیسے 20

ستمبر کو شرجیل کا یومِ شہادت 21 ستمبر کو یومِ تدفین۔ پھر 16 دسمبر 2014 کو سانحہ پشاور۔ اس کے سارے ماحول میں کیا لکھوں۔ ایک ماں کی حیثیت سے میری ساری قوتیں ہی سلب ہوگئیں ان ماؤں کا دکھ بھی مجھ جیسا یا پھر مجھ سے بھی بڑا دکھ ہے۔ یہ صرف وہی مائیں جانتی ہیں جن کے جگر گوشے اُن کی آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ جیسے یہ سب بچے میرے سگے بھانجے ہوں اور سٹاف ممبرز میرے سگے بہن بھائی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ ان بچوں کے ساتھ میرے بھانجوں اور بھانجی نے پڑھا ہے۔ وہ بچے ان کے دوست اور کلاس فیلوز تھے۔

کچھ عرصہ پہلے میرے دونوں بہنوئی پشاور میں ہی پوسٹ تھے۔ حذیفہ بابر میرا بڑا بھانجا جو کرنل بابر کا بیٹا ہے اور سعد میرا بھتیجا کرنل مبین کا بیٹا ہے۔ سعد مبین لندن گیا ہوا ہے' کہنے لگا می میں نے آرمی جوائن کرنی ہے۔ شرجیل بھائی اور پشاور والے بچوں کا بدلہ لینا ہے۔ اس وطن کے لئے ہمارے بچوں کے جذبے، بہت شدید ہیں۔ شہداءِ پشاور والے بچوں کی شہادت کے بعد کسی حد تک حُدود کا نفاذ شروع ہوا ہے (حدیث کا مفہوم ہے) جس جگہ کوئی حد قائم ہوتی ہے وہاں پر چالیس دن بارش برسنے کے برابر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ یعنی ایسی نفع بخش بارش جس میں فائدہ ہوتا ہے' ہریالی ہوتی ہے۔ جب کسی کو قرآن کے حکم کے مطابق حد لگائی جائے۔

ایک روز کیپٹن شمیلہ نے کہا کہ کیا ہی اچھا ہوا گر ڈاکٹر عثمان کو پہلی پھانسی دی جائے۔ اسی طرح ٹی وی پر نیوز سنتے ہوئے لاؤنج میں شاہد کہنے لگے کہ اگر جمعۃ المبارک کے دن پہلی پھانسی عثمان کو دی جائے تو عدل کے تقاضے پورے ہو جائیں حالانکہ اور بھی لوگ تھے مگر اس کا نام زبان پر آیا۔ جب عثمان کو پھانسی دی گئی تو میں نے شاہد کو مبارک باد دی۔ اس کا تو دُہرا جرم تھا۔ پاک فوج کے ساتھ حلف کی غداری بھی کرنے کا۔ ان دہشت گردوں کا ایک ہی علاج ہے وہ ہے سزائے موت۔ کیا ہی اچھا ہوا گر ان کے سر قلم کئے جائیں۔ میں نے شاہد سے کہا کہ ان معصوم شہداء کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ ابتدا ہو چکی ہے اب انتہا پر جا کر اس پاک سرزمین کو ان کے ناپاک

جسموں سے پاک کیا جائے۔ ان کے ناپاک ارادوں کو کچلا جائے یقیناً اس نیک کام کی ابتدا کرنے کا سہرا بھی پاک فوج کے سربراہ کے سر ہی جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ملک اور افواجِ پاکستان کی حفاظت فرمائے۔

(آمین)

پاک افغان سرحد سے

لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود

دیر بالا میں میجر جنرل ثناءاللہ نیازی شہید نے جس مقام پر جام شہادت نوش کیا عین اس کے نیچے شاہی کوٹ کے علاقے سے مغرب کی طرف جاتے ہوئے پہلا گاؤں 'شلتلو' پہاڑیوں کے دامن میں بکھرا پڑا ہے۔ دُور اُفق پر نظر آنے والا نصرت کنڈاؤ (درہ) پاکستان اور افغانستان کے درمیان آسمان کو چُھوتے پہاڑوں میں انگریزی حرف 'وی' کی شکل میں ایک بڑی گزرگاہ مہیا کرتا ہے۔ اسی علاقے میں جون 2011 میں دہشت گردوں نے 18 سیکیورٹی اہلکاروں کو بے رحمی سے ذبح کیا تھا۔ دِیر لوئر، دِیر بالا اور چترال کی اِس پاک افغان سرحد پر ایسے سات نمایاں درّے ہیں۔ سوات میں شورش سے پہلے اِن درّوں سے دونوں ممالک کے درمیان بلا روک ٹوک آمدورفت اور سامان کی نقل وحمل ایک معمول تھا۔ دونوں اطراف میں بسنے والے لوگوں نے آپس میں شادیاں بھی کر رکھی تھیں اور سال ہا سال سے رشتوں کے بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔ کِسی کی نانی اِدھر تھی تو دادی اُس پار، ماموں پاکستان میں تھے تو چچا افغانستان میں۔ رشتوں کی اِسی امربیل کی وجہ سے دونوں اطراف کے لوگ ایک دُوسرے کے عزت و اِحترام اور باہمی اُنس و پیار میں پروئے ہوئے تھے۔ آپس کے لین دین میں آٹے دال کا افغانستان جانا یا پاکستان میں لکڑی کی معمولی سمگلنگ سے بھی صرف نظر ہوتا رہا، البتہ باقاعدہ سمگلنگ کی روک تھام کے لئے ایف سی اور پولیس چوکیاں موجود تھیں جو بوقت ضرورت ایسی کوششوں کو روکنے کے لئے اپنا کردار ادا کرتی تھیں۔

2009ء میں جب حکومت نے خیبر پختونخوا میں سیکیورٹی فورسز کی خدمات حاصل کر لیں تو

فضل اللہ اور اس کے حواریوں کے لئے عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ میں چھوڑ دِیر کے پہاڑی درّوں کے راستے افغانستان جا چھپے۔ دراصل دِیر کے لوگوں نے اِن دہشت گردوں کو یہاں بسنے نہیں دیا ورنہ اُن کی پہلی کوشش یہی تھی کہ سوات کے بعد دِیر کو محاذ جنگ بنایا جائے۔ جب دِیر کے لوگوں نے دہشت گردوں کے گھناؤنے کھیل کا حصہ بننے سے اِنکار کر دیا تو ان کا خیال تھا کہ چند دنوں میں فوج واپس چلی جائے گی اور یہ واپس آجائیں گے۔ ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونا تو درکنار پاکستان واپسی کی کوشش میں انہیں منہ کی کھانی پڑی اور متعدد دہشت گرد پاک فوج کے ہاتھوں ہلاک یا زخمی ہوتے رہے۔ اس پر دہشت گرد سرغنہ فضل اللہ نے سرحد پار بیٹھ کر دِیر کے لوگوں کو سبق سکھانے کا منصوبہ بنایا۔ دہشت گردوں کے جتھے درّوں میں سے گزر کر دِیر اور چترال کے علاقے میں آتے اور نہتے لوگوں کو اِنتقام کا نشانہ بناتے۔ کبھی وہ اِن کے مویشی چُرا کر لے جاتے تو کبھی اِن کے سکولوں اور ہسپتالوں کو جلا دیتے۔ صرف شاہی کوٹ، پنہ کوٹ، برال اور نصرت کے علاقوں میں 40 سے زائد سکولوں کو نذرِ آتش کر ڈالا۔ اِس علاقے میں دہشت گردی کی اِن کارروائیوں کی روک تھام کے لئے ابھی تک کوئی سپاہ تعینات نہیں تھی البتہ شلتلو میں ایف سی اور پولیس کی ایک مشترکہ چوکی پر 26 لوگ تعینات تھے جن کے فرائض میں پاک، افغان سرحد سے چھوٹی موٹی سمگلنگ کو روکنا تھا۔ 31 مئی 2011 کی شام بظاہر معمول کی شام تھی۔ کوئی بھی غیر معمولی واقعہ یا نقل و حرکت دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ نالے کے اِرد گرد اور پہاڑ کی ڈھلوانوں پر چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں غریب کسان اپنے بیوی بچوں سمیت کام کر کے گھروں کو لوٹ آئے تھے۔ مویشی اپنا پیٹ بھرنے اور نالے سے جی بھر کر پانی پینے کے بعد اپنے کھونٹوں پر پہنچ چکے تھے۔ اخروٹ کے درختوں پر کِھلے چھوٹے چھوٹے پُھولوں کی پتیاں اب بند ہونے لگی تھیں۔ نالے میں بہتے جھرنوں کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا۔

شلتلو چوکی پر تعینات ایف سی کے جوانوں نے بھی حسبِ معمول شام کا کھانا تناول کیا اور ڈیوٹی پر تعینات چند سنتریوں کے علاوہ باقی سب نے اپنا اسلحہ مقررہ جگہ پر جمع کرا دیا۔ اب تمام

جوانوں نے ملحقہ مسجد میں مقامی اِمام تاج محمد کی اِقتداء میں نمازِ عشاء ادا کی اور خوابِ استراحت میں کھو گئے۔ امام مسجد تاج محمد کا گھر بالکل پاس ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تاج محمد چوکی کے لوگوں سے گھر کے افراد کی طرح نہایت شفقت اور پیار سے پیش آتا تھا۔ تاج محمد کے اپنے چھوٹے چھوٹے پانچ بچے تھے۔ جن میں سب سے بڑے زاہداللہ کی عُمر 13 سال تھی۔ اس روز نمازِ عشا کے بعد تاج محمد گھر آ کر جلدی سو گیا تھا، صبح بھی جلدی اُٹھنا ہوتا تھا کیونکہ تاج محمد امام مسجد ہونے کے ناتے سب سے پہلے مسجد جا کر جھاڑ پُونچھ اور پانی کا بندوبست یقینی بناتا، تہجّد پڑھتا اور پھر اذان فجر کہتا۔ تاج محمد کو الارم کی ضرورت بھی نہ پڑتی تھی، خود بخود رات کے پچھلے پہر آنکھ کھل جاتی اور وہ اپنے موبائل سے وقت دیکھ کر جھٹ سے بستر چھوڑ دیتا۔ یکم جون 2011ء کی سحر تاج محمد اور اُس کے اہلِ خانہ کے لئے قیامت کی گھڑی ثابت ہُوئی۔ 3 بجے کے قریب یکا یک تڑتڑ کی آوازیں آنے لگیں، ایک ساتھ سینکڑوں گولیاں چل رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُن کے اپنے گھر پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو۔ باہر جھانکنے کی گنجائش تک نہ تھی۔ تاج محمد نے کلمۂ طیبہ پڑھتے ہوئے دُعائے خیر شروع کر دی۔ بچے سہم گئے اور بچوں کی ماں اُن کو حوصلہ دینے لگی۔ جلد ہی اِنہیں گھر کے باہر سے شلتلو چوکی اور مسجد کی طرف سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دِکھائی دیئے۔ دوسرے ہی لمحے تاج محمد کے گھر کے دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی اور کسی نے مدد کے لئے پُکارا۔ ''ارے یہ تو سبز علی کی آواز ہے''۔ تاج محمد نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ سبز علی خان پولیس کا ایک اُدھیڑ عُمر سپاہی تھا۔ اُس نے بتایا کہ تین سو کے قریب دہشت گردوں نے چوکی پر حملہ کر دیا تھا۔ اُن لوگوں نے ڈیوٹی پر مامور جوانوں کو پہلے ہی گولی مار دی تھی اور اب سوئے ہوئے نہتے اہلکاروں کو بہت بُری طرح قتل کر رہے تھے۔ کچھ جوانوں نے بھاگ کر مسجد میں پناہ لینی چاہی تو پوری مسجد کو نذرِ آتش کر دیا، ساتھ ہی مڈل سکول شلتلو کی عمارت تھی، دہشت گردوں نے شک کی بنیاد پر سکول کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ پولیس اہلکار سبز علی خان کے پاس ہتھیار تو تھا نہیں، کیونکہ تمام ہتھیار ایک جگہ سٹور میں جمع تھے اور اِس پر دہشت گردوں نے قبضہ کر لیا تھا، وہ وہاں سے جان بچا کر بھاگا اور سیدھا سامنے امام مسجد

تاج محمد کے گھر میں پناہ لینے پہنچ گیا تھا۔ ابھی سبز علی خان کو امام مسجد کے گھر داخل ہُوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ دہشت گرد بھی پہنچ گئے اور اُسے حوالے کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ تاج محمد نے دہشت گردوں کو نہایت عاجزانہ طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ پختون روایات کے خلاف ہے کہ میں اپنے گھر میں پناہ گزیں شخص کو آپ کے حوالے کر دوں۔ دہشت گردوں نے امام صاحب کو دھمکی دی کہ اگر وہ پولیس کے جوان کو اُن کے حوالے نہیں کریں گے تو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ ہاں البتہ اگر پولیس کانسٹیبل سبز علی خان کو حوالے کر دیں گے تو اُنہیں کوئی گزند نہیں پہنچائے گا۔ امام شلتلو کے سامنے ایک طرف اُس کی بیوی اور پانچ بچوں کا واحد سہارا بچ جانے کی اُمید تھی اور دُوسری طرف اپنی روایات کا پاس کرتے ہُوئے جان کی قُربانی تھی۔ تاج محمد شلتلو کا امام تھا، اُسے معلوم تھا کہ اُس کا فیصلہ تاریخ میں صدیوں تک محفوظ ہونے والا فیصلہ ہوگا۔ آج اگر امام ڈگمگا گیا تو پیروکار صدیوں بھٹکتے رہیں گے۔

امام شلتلو نے فیصلہ کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا اور دہشت گردوں کو صاف الفاظ میں جواب دے دیا۔ ''میں اپنے گھر میں پناہ لینے والے کو کبھی تمہارے حوالے نہیں کروں گا، خواہ میری جان چلی جائے''۔ امام صاحب نے امامت کا حق ادا کر دیا تھا۔ تاریخ رقم ہو چُکی تھی۔ کئی گھنٹے کی قتل و غارت کے بعد جب پاک فوج وہاں پہنچی اور علاقے کی تلاشی لی گئی تو تاج محمد کے گھر سے ملنے والی پہلی لاش امام شلتلو تاج محمد کی تھی اور پولیس کانسٹیبل سبز علی خان بھی جام شہادت نوش کر چکے تھے! تاج محمد کے نوجوان بیٹے زاہد اللہ سے ہم نے ملاقات کی تو اس کی آنکھوں میں اپنے باپ کے کردار پر فخر کی چمک اور بے پناہ سکون تھا۔ اگست 2011ء میں ہی پاک فوج نے پورے افغان بارڈر کے ساتھ ساتھ چیک پوسٹوں پر ایک بڑی تعداد میں سپاہ تعینات کر دی اور سرحد کو مکمل طور پر سیل کر دیا۔ فوج کے ساتھ ساتھ دیر کے لوگوں نے بھی سیکیورٹی فورسز کے ساتھ مل کر نفوذ کی کسی بھی کوشش کو ناکام بنانے کے لئے ویلج ڈیفنس کمیٹیاں بنالیں۔ اِس صورتِ حال میں بُری طرح مایوس اور حواس باختہ ٹی ٹی ایس نے دِیر بالا کے علاقے سے پاکستان کے دفاعی حصار کو

توڑنے کی متعدد کوششیں کیں۔صرف 2011ء اور 2012ء میں افغانستان کے صوبے کنڑ اور نورستان میں چھپے ہوئے ان دہشت گردوں نے پاک افغان سرحد سے پاکستان میں دراندازی کی کم وبیش 20 کوششیں کیں۔ان کوششوں میں ان لوگوں نے 120 افراد کو شہید کیا جن میں زیادہ تر سویلین تھے اور چند لیویز اور سیکیورٹی فورسز کے اہلکار شامل تھے۔دِیر کے لوگ پہلے ہی اِن ظالموں سے نالاں تھے۔دہشت گردوں کا شروع سے ہی یہ طریقہ تھا کہ اگر اُن کے ہتھے کوئی سرکاری اہلکار یا پاک فوج کا جوان چڑھ جاتا تو وہ اُس کا مثلہ کرتے جو زمانہ جاہلیت میں کچھ قبائل کیا کرتے تھے یا پھر جب عیسائیوں نے مسلمانوں کی بے خبری میں اچانک حملہ کر کے بیت المقدس چھینا تو اُس وقت بیت المقدس میں محوِصلوٰۃ ستر ہزار نہتے نمازیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر ڈالا، بیت المقدس کے دروازوں سے خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔لیکن مسلمانوں کا طریق کار یہ نہیں ہے۔ جب سلطان صلاح الدین نے عیسائیوں کو شکست دے کر بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ بحال کیا تو اُس وقت بھی کئی ہزار عیسائی اپنی عبادت میں مشغول تھے،مسلمانوں نے ایک عیسائی کی بھی بے حُرمتی نہیں کی اور انہیں عزت واحترام سے مسجدِ اقصیٰ سے نکل جانے کا موقع دیا۔

(بحوالہ مسلمانوں کی تاریخ از جمیل یوسف)

ساری دنیا کے لوگ حیران ہیں کہ یہ کون سے مسلمان ہیں جو شہداء کے سر تن سے جُدا کر کے ساری دُنیا کو فخر سے دکھاتے ہیں اور اپنے اس گھناؤنے فعل کو اسلامی جہاد قرار دیتے ہیں۔دہشت گردوں کی تمام تر سفاکیوں کے باوجود پاک فوج خطّے میں امن وسکون کی بحالی اور فلاح و بہبود پر توجہ دیتی رہی۔پاک فوج کے اہلکار پسماندہ علاقوں میں مفت طبی کیمپ لگاتے۔مخمے،شاہی کوٹ اور جان بھٹائی میں مریضوں کو مفت علاج معالجہ اور ادویات مہیا کرتے،اکثر مریضوں میں ایک بڑی تعداد خواتین کی ہوتی،جن کے لئے پاک فوج کی لیڈی ڈاکٹرز کی خدمات پیش کی گئیں۔دِیر بالا (شاہی کوٹ) میں ہماری ملاقات روزی خان سے ہوئی۔روزی خان یوں گویا ہوئے،''یہ لوگ ہمارے مویشی پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ہمارے علاقے کی لکڑی سمگل کرتے ہیں۔انہوں نے

ہمارے سکولوں کو جلایا اور مسجدوں میں بھی ہمارے لوگوں کو شہید کیا''۔ ان دِنوں اُس سیکٹر میں پاک فوج کے سیکٹر انچارج لیفٹیننٹ کرنل اشرف لاکھو تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جب فوج اس علاقے میں تعینات ہوئی تو اس وقت تک دِیر کے اس حصے کے 32 میں سے 11 سکول دہشت گردوں نے مکمل طور پر جلا کر خاکستر کر دیئے تھے۔ فوج نے اُن کی تعمیرِ نو کا کام 30 نومبر 2011 سے شروع کیا اور 10 جنوری 2012 تک مکمل کر لیا۔ دریں اثنا اساتذہ اور طلباء بھی خوفزدہ ہو کر تتر بتر ہو چکے تھے۔ چنانچہ 46 اساتذہ اور 1256 طلباء کو دوبارہ ڈھونڈ کر اِن سکولوں میں تعلیم کا تسلسل باقاعدہ طور پر بحال کر دیا گیا۔ 300 سے زائد طلباء کو پاک فوج نے سردیوں کی یونیفارم اور کُتب دے کر سلسلۂ درس و تدریس بحال کیا۔ لوگوں کے سماجی، ثقافتی اور معاشرتی معمولات میں بہتری کے لئے بھی متعدد اقدامات اُٹھائے گئے۔ جیسے مقامی بازاروں اور راستوں کو بہتر کیا گیا اور تفریح کے لئے کھیلوں کے مقابلے کرائے گئے۔ سیکیورٹی کے حوالے سے سول حلقوں میں اطلاعات اور معلومات کے تبادلے کا بہترین نظام ترتیب دیا گیا اور علاقے کو غیر قانونی ہتھیاروں سے پاک کرنے کے لئے مقامی لوگوں سے اپیل کی گئی تو سینکڑوں کی تعداد میں کروڑوں روپے کے بھاری ہتھیار رضا کارانہ طور پر سیکیورٹی فورسز کی تحویل میں دے دیئے گئے۔

پاک فوج کی حکمتِ عملی اور کارکردگی بلاشبہ قابلِ تحسین ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان 490 کلومیٹر سرحد کے پار سے دراندازی کرنے والے اِن دہشت گردوں کے پاس جدید ترین اسلحہ و بارُود کہاں سے آ رہا ہے؟ جبکہ سوات اور دِیر سے تو وہ ایک کلاشنکوف کے ساتھ بھاگے تھے۔ اِن کو فنڈز کون دیتا ہے اور سرپرستی کون کر رہا ہے؟ اور یہ کہ ان کو لگام کون دے گا؟

کیپٹن نواب زادہ جاذب رحمٰن شہید

مریم ارشاد

جب بھی قومی ترانے کی صدا فضا میں گونجتی ہے، جب بھی یہ پرچم آب و تاب سے ہوا میں لہرایا جاتا ہے، جب بھی ہم پُرسکون اور پُرفضا ماحول میں سانس لیتے ہیں تب ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں ایک سوچ جنم لیتی ہے کہ اس پرچم کی سربلندی اور پُرسکون فضا کے لئے دھرتی کے جیالوں نے اپنی قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ آپریشن ضربِ عضب ہو یا سوات آپریشن، جس دلیری سے یہ افواج لڑیں اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ دشمن کو یہ سبق ملا کہ وہ دنیا کی بہترین عسکری قوت سے لڑ رہا ہے۔ آج ایک شیر دل جوان کا تذکرہ کرنے لگی ہوں۔

کیپٹن نواب زادہ جاذب 7 نومبر 1993 کو کوہاٹ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی مشکلات سے کھیلنے کا شوق رکھتے۔ گھڑسواری کے ماہر تھے۔ نیزہ بازی کے فن میں بھی مہارت حاصل تھی۔ سکول جاتے تو اکثر کلاس کی تعداد کے مطابق ایک جیسی چیزیں لے کر جاتے، خوشیاں تقسیم کرنے کے شوقین تھے۔ آپ نے میٹرک اور ایف ایس سی کیڈٹ کالج کوہاٹ سے کی۔ مختلف کالجوں سے ٹیسٹ پاس کئے۔ آئی ایس ایس بی کے لئے فارم جمع کروائے اور والدہ سے کہا کہ میں اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ دولت کی فراوانی اس قدر تھی کہ اگر تعلیم مکمل کر کے کوئی بزنس کرتے تو زندگی آسانی سے گزر جاتی۔ کیڈٹ کالج کوہاٹ کے پرنسپل بریگیڈیئر انعام الحق نے بھی کیپٹن جاذب کے والدین سے کہا کہ یہ بہت ذہین اور محنتی ہے، ایم بی بی ایس کروائیں۔ جاذب اپنے گھر والوں کے بہت لاڈلے تھے۔ ان سے اپنی ہر بات منوا لیتے اسی لئے پاک فوج میں بھی جانے کی اجازت آسانی سے مل گئی۔ پاک فوج سے جب اُنہیں کال آئی تو وہ خوشی کے مارے پھولے نہ

سمائے۔کیپٹن جاذب کو جنون کی حد تک آرمی میں جانے کا شوق تھا۔وردی سے محبت تھی۔جب بھی پرچم دیکھتے سلیوٹ کرتے۔فوجی دیکھتے تو سلیوٹ کرتے۔چیف آف آرمی سٹاف کو ٹیلی ویژن پر دیکھتے تو کھڑے ہو جاتے اور سلیوٹ کرتے۔

16 نومبر 2011 کو پی ایم اے 128 لانگ کورس میں شمولیت اختیار کی یوں پاک فوج میں شمولیت کے جنون کو تعبیر ملی۔12 اکتوبر 2013 کو PMA کاکول سے پاس آؤٹ ہوئے تو جاذب کراس بیلٹ ہولڈر تھے۔

والدہ کا کہنا تھا کہ جاذب کو تین گاڑیوں میں بارات کی طرح ملٹری اکیڈمی کاکول لے کر گئے،اس پر جاذب کے ڈرائیور نے ازراہِ تفنن ان سے کہا کہ یہ تو شادی اور بارات کی طرح ہے۔وہی کر لیتے۔جاذب نے کہا کہ مجھے جنون کی حد تک شہادت کا شوق ہے۔کیپٹن جاذب بہت دلیر اور نڈر تھے۔ان کے کمانڈنگ آفیسر ان کو چیتا کہتے۔وہ بہت اصول پسند تھے۔ایک دفعہ دورانِ سفر جاذب نے کسی پولیس والے کو ایک ڈرائیور سے پیسے لیتے دیکھ لیا تو رُک گئے اور پولیس والے سے کہا بھائی آپ نے ٹرک والے سے پیسے لے کر جانے دیا۔اگر اس میں بارود ہوا تو۔۔۔؟ایسے کام دیکھ کر اور باتیں سُن کر افسردہ ہو جاتے اور کہتے کہ پاکستانی قوم دُنیا کو کیا تاثر دے رہی ہے۔اکثر کہتے کہ ہمارے جوانوں کو دنیا کو اچھا تاثر دینا چاہئے،وہ قومیں ترقی کرتی ہیں جو اپنے محسنوں کے نقشِ قدم پر چلتی ہیں اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں۔

کیپٹن جاذب کو کیا معلوم تھا کہ وہ ایک دن قوم کے محسن کے طور پر یاد کئے جائیں گے، ہماری نوجوان نسل کے لئے رول ماڈل ہوں گے۔ایک ماہ کے اندر جاذب نے کئی آپریشن کئے۔آپ نے طالبان کے بڑے بڑے لیڈر پکڑے آپ کو فون پر افغانستان سے دھمکی آمیز کالز موصول ہوتیں جن کے جواب میں کیپٹن نواب زادہ جاذب رحمٰن بڑی دلیری سے کہتے کہ تم گیدڑ ہو اور میں شیر ہوں،سامنے سے حملہ کرنا،میں منہ توڑ جواب دوں گا۔ان کے سی او کرنل بلال انہیں ڈانٹتے تو

وہ شرارتی آنکھوں سے مسکرا دیتے ڈانٹ کی وجہ یہ ہوتی کہ باوجود اتنی دھمکیوں کے ہر آپریشن کے لئے تیار ہو جاتے اور کہتے جو رات قبر میں ہوگی، اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔

1965 اور 1971 کی جنگ میں تو ایک دشمن تھا ہندوستان، لیکن اب جنگ کے انداز بدل گئے۔ دشمن ہماری صفوں میں موجود ہیں۔ پہلے صرف بیرونی دشمن ہوتا تھا، اب اندرونی دشمن بھی ہیں۔ پاک فوج کو سلام جس کی عظیم قربانیوں سے اس ملک کی بہاریں لوٹ آئی ہیں۔ کیپٹن نواب زادہ جاذب رحمٰن اور دوسرے تمام شہداء کے ہم مقروض ہیں ان جوانوں کی دلیری کی بدولت دہشت کے سائے اس ارضِ وطن سے مٹ گئے فوج اور ملک کے دفاع کے لئے انہوں نے اپنی جوانی لُٹا دی۔ ان کی عظیم ماؤں کو سلام جنہوں نے ایسے جواہرِ نایاب کو جنم دیا اتنی زبردست پرورش کی۔

نواب زادہ جاذب رحمٰن اس دھرتی کا وہ بہادر سپوت ہے جس نے 25 سال کی عمر میں وہ کر دکھایا جو لوگ 75 سال کی عمر میں بھی نہیں کر سکے۔ کیپٹن جاذب رحمٰن شہید کی داستانِ شہادت، باعثِ صد فخر و مباہات ہے۔ ایسا محبِّ وطن پاکستانی جس نے دھرتی کے سکون کے لئے اپنی جان بطورِ عطیہ دے دی۔ دِیر میں بھی کئی کامیاب آپریشن کئے سوات میں بھی لاتعداد انٹیلی جنس بیسڈ کامیاب ملٹری آپریشن کئے۔ آپریشن کے دوران جوانوں کا مورال بلند کرتے۔ انہیں خوف کو دلوں سے باہر نکالنے کا کہتے۔ وہ بہت جذباتی تھے اکثر کہتے تھے وطن کی خاک سے ہمارے خواب منسوب ہیں اور اس خاک پر ناپاک دشمن کا سایہ وطن کے جانبازوں کو گوارا نہیں۔ سرزمینِ پاکستان غازیوں کی سرزمین، سربکف لڑنے والے جانبازوں کی سرزمین، ایسے شیروں کی سرزمین ہے جو دھرتی کے دشمنوں کے دانت توڑ دیتے ہیں۔ کیپٹن نواب زادہ جاذب رحمٰن کے ایک سینیئر نے کہا کہ دہشت گرد اُس وقت خودکش حملہ کرتے ہیں جب اُن کی گردن پر پاؤں رکھا جاتا ہے اور انہیں سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ کیپٹن نواب زادہ جاذب رحمٰن نے ان دہشت گردوں کی گردن پر پاؤں رکھا۔ دہشت گردوں کا سربراہ جب سامنے آیا تو سی او نے کہا کہ نفری بلائی ہے انتظار کرو تو

کیپٹن جاذب رحمٰن نے کہا کہ میں خود کو نہیں روک سکتا۔نفری آنے تک یہ بھاگ جائے گا۔گولیوں کی بوچھاڑ میں کیپٹن جاذب نے دہشت گردوں کے سربراہ کو پکڑ لیا۔

کیپٹن جاذب رحمٰن کی والدہ کا کہنا تھا کہ جب بھی کسی شہید کی برسی ہوتی ہے تو ہم سب شہداء کی مائیں اکٹھی ہو کر اپنے بیٹوں کی باتیں کرتی ہیں۔سب ماؤں نے اپنے ہونہار ہیرے ہماری اس پُرسکون فضا کے لئے قربان کئے۔گزشتہ سال جنوری کا آخری عشرہ نوابزادہ جاذب رحمٰن نے راولپنڈی میں گزارہ۔اسی دوران جب وہ اسلام آباد کے بڑے شاپنگ مال میں والدہ کے ساتھ تھے،تو دھمکی آمیز فون افغانستان سے آیا۔نواب زادہ جاذب رحمٰن نے انہیں کہا کہ گیدڑوں کے حملوں کا منہ توڑ جواب دوں گا۔آپ اکثر خوارج کو گیدڑ کہتے۔

والدہ کو ہاٹ جا رہی تھی اور کیپٹن نواب زادہ جاذب رحمٰن سوات جا رہے تھے۔والدہ سے کہنے لگے امی اگر میرا جسدِ خاکی پرچم میں لپٹا ہوا آئے تو عام ماں کی طرح نہیں،شیر کی ماں طرح مجھے خوش آمدید کہنا۔

سوات سٹیڈیم میں والی بال کھیل رہے تھے کہ تین خودکش بمبار داخل ہو گئے۔جاذب نے اکیلے بڑی بہادری سے دو کو جہنم واصل کیا جبکہ تیسرے نے خودکش جیکٹ پھاڑ دی یوں نواب زادہ جاذب رحمٰن نے جامِ شہادت نوش کیا اور ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو گئی۔

ایک منفرد شخصیت کے حامل نوابزادہ جاذب رحمٰن شہید خوشیاں تقسیم کرنے کے عادی تھے بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔وردی اور پرچم کی حرمت کے لئے اپنے پورے خاندان کو اشکبار چھوڑ گئے۔اور 7 نومبر کو آپ کے یومِ ولادت کے موقع 2018 میں بحریہ ٹاؤن راولپنڈی اور بحریہ ٹاؤن کراچی کی مساجد کیپٹن نواب زادہ جاذب رحمٰن شہید کے نام سے منسوب کی گئیں۔سلام ایسے جیالوں پر جنہوں نے قوم کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔سلام ان جوانوں کو جنہوں نے جارحانہ آپریشن کر کے دہشت گردوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔سلام اُن والدین کو جنہوں نے بڑھاپے کے سہارے کو مٹی کی آغوش میں سُلا دیا۔

عظیم ماؤں کے بہادر جوان بیٹے

کیپٹن علی رؤف مگسی شہید (تمغۂ بسالت) کے حوالے سے محمد اسلم لودھی کی تحریر

کیپٹن علی رؤف مگسی پاک فوج کا وہ بہادر افسر ہے جس نے فوج میں شامل ہو کر نہ صرف اپنے وطن کا نام سربلند کیا بلکہ اپنے مگسی قبیلے کی عزت کو بھی چار چاند لگا دیئے۔ کیپٹن علی، پاک فوج کے ایک شیر دل افسر، کرنل سردار عبدالرؤف خاں مگسی (ر) کے فرزند ہیں۔

کیپٹن علی کی رگوں میں ایک دلیر باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔ جس نے پاک فوج کو جوائن ہی اس لئے کیا کہ ملک دشمنوں کے خلاف نبرد آزما ہو کر اپنے وطن اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ یہ 28 جنوری 1998ء کا واقعہ ہے، کہ اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں کرنل مگسی (ر) اور کیپٹن علی محوِ گفتگو تھے۔ بیٹا سوال کرتا ہے، ابو پاک بھارت جنگ کب ہوگی؟ والد نے بتایا بیٹا پاکستان اور بھارت دونوں ایٹمی طاقتیں ہیں، اس لئے کھلی جنگ کا امکان نہیں، کیونکہ یہ جنگ دونوں کی تباہی کا باعث بنے گی۔ یہ سن کر کیپٹن علی نے کہا ابو میں تو فوج میں شامل ہی اس لئے ہوا ہوں کہ بھارت کے ساتھ جنگ کر کے شہادت کا جام نوش کر سکوں، اگر جنگ نہیں ہوتی تو کیا میں فوج کو خیر باد کہہ دوں۔ والد نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا کہ بیٹا سیاچن ایک ایسا مقام ہے جہاں اب بھی، دونوں ملکوں کی فوجیں برسرِ پیکار ہیں اور وقتاً فوقتاً جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ سنتے ہی کیپٹن علی خوشی سے اچھل پڑے اور کہا تو پھر آپ میری ٹرانسفر اس یونٹ میں کروا دیں جس کی ذمہ داری میں سیاچن کا دفاع ہے۔ میں دنیا کے کسی بھی حصے میں بھارتی فوج سے لڑنے کو تیار ہوں۔

کیپٹن علی کی باتیں باپ کی سمجھ سے بالاتر تھیں وہ دل و جان سے اپنے اس عزیز اور عظیم بیٹے سے ہر باپ کی طرح محبت کرتے تھے۔ کرنل مگسی نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا بیٹا ایک مرتبہ پھر سوچ لو کیونکہ تم نے سیاچن کا نام سنا ہے اس کے قہر اور حشر سامانیوں کا شاید تمہیں اندازہ نہیں۔ سیاچن دنیا کا وہ منفرد اور بلند ترین محاذِ جنگ ہے جہاں لڑی جانے والی جنگ، دنیا کی دیگر جنگوں سے بہت مختلف ہے۔ بیس سے چھبیس ہزار فٹ بلندی پر واقع سیاچن کا محاذِ جنگ، صحراؤں، پہاڑوں، جنگلوں اور سمندروں کے جنگی میدانوں سے یکسر مختلف ہے۔ یہ جنگ ایسی کھڑی سنگلاخ چٹانوں پر لڑی جا رہی ہے جہاں جنگ لڑنا تو درکنار ناقابلِ عبور برفانی ڈھلوانوں اور چوٹیوں کو دیکھ کر ہی پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پھر کرنل مگسی بولے بیٹا یہ پاکستان آرمی کی قائدانہ صلاحیتوں کے امتحان کی جنگ ہے۔ یہ سرفروشوں کی رگوں میں دوڑتے ہوئے گرم لہو کی جنگ ہے، یہ ملک و قوم کی عظمتوں کے تحفظ کی جنگ ہے۔ سیاچن ایسا مقام ہے جہاں فنا سے بقا کی نوید ملتی ہے اور شہادتوں سے عظمتوں کے چراغ جلتے ہیں۔

کیپٹن علی، والد کی باتیں بہت حیرانی سے سن رہے تھے۔ جب والد چند لمحوں کے لئے خاموش ہوئے تو کیپٹن علی بولے! ابو کیا واقعی سیاچن بہت مشکل محاذِ جنگ ہے جس کے تصور سے ہی انسان کو جھرجھری آجاتی ہے؟ کرنل مگسی نے کہا جی بیٹا۔ یہ ایسا مقام ہے جہاں حدِ نگاہ تک برف ہی برف دکھائی دیتی ہے، زندگی ناپید اور سانس لینے میں سخت دشواری محسوس ہوتی ہے۔ جہاں موت، زندگی سے پہلے اور بیماری، تندرستی سے پہلے پہنچ جاتی ہے۔ جہاں قدم قدم پر سانس رکتی اور خون رگوں میں جمتا محسوس ہوتا ہے۔ وہاں ایسے ایسے خوفناک برفانی طوفان آتے ہیں جو سامان سمیت خیمے اڑا کر لے جاتے ہیں اور زندہ انسانوں کو برف کی تہوں میں دفنا دیتے ہیں۔ سیاچن میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے اچانک پھسلنے والے برف اور مٹی کے تودے اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ یہاں ایک طرف جمی ہوئی برف کی دیواریں ہیں تو دوسری جانب انسانوں کو نگل جانے والی گہری کھائیاں جو برف کی ہلکی پرت سے ڈھکی ہوئی اپنے شکار کی

ہر لمحے منتظر رہتی ہیں ۔ یہاں فطرت اپنی پوری قہر سامانیوں کے ساتھ انسانوں کی قوتِ برداشت، اعصاب، حوصلے، صبر وتحمل، جذبۂ ایثار، حب الوطنی اور شوقِ شہادت کا کڑا امتحان لیتی ہے ۔ یہاں کتنے ہی پاک فوج کے جانباز برفانی طوفانوں کی نذر ہو چکے ہیں ۔

ان کا خیال تھا کہ بیٹا ان باتوں سے مرعوب ہو کر سیاچن جانے کا ارادہ ترک کر دے گا لیکن انہیں اس وقت حیرانی کا سامنا کرنا پڑا جب ان باتوں نے کیپٹن علی کے دل و دماغ میں سیاچن جانے کا اشتیاق مزید بڑھا دیا۔ اس کے ارادے پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئے ۔ وہ تو پیدا ہی ایسے خطرات سے کھیلنے کے لئے ہوا تھا۔ مگسی قبیلے کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا یہ وہ بلوچ قبیلہ ہے جس نے انگریز فوج کے خلاف بھی جرأت و بہادری کے جوہر دکھائے تھے ۔

جب کیپٹن علی کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو بالآمر مجبوری کرنل مگسی نے جی ایچ کیو پہنچ کر اپنے بیٹے کا تبادلہ این ایل آئی یونٹ میں کروا دیا جو سیاچن میں تعینات تھی اور بھارتی فوج سے اس بلند ترین محاذ پر برسرِ پیکار تھی ۔ بعد ازاں کیپٹن علی کی اپنی یونٹ 40 بلوچ بھی سیاچن جا پہنچی تو کیپٹن علی اپنی یونٹ میں واپس آ گئے ۔ کیپٹن علی کے ساتھی بتاتے ہیں کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کیپٹن علی کے جسم میں قدرت نے بجلیاں بھر دی ہوں ۔ کسی عمودی چٹان سے خوفزدہ نہیں ہوئے، اتنی مہارت سے برفانی چوٹی پر چڑھتے جیسے ان کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ ہو ۔ سیاچن کی بلند ترین پوسٹ پر پہنچتے ہی ان کا سامنا بھارتی فوج سے ہو گیا ۔ کیپٹن علی کے کمانڈنگ آفیسر کرنل کامران رضا ان کی پیشہ ورانہ خدمات اور بہادری پر بہت نازاں تھے جس کا اظہا کیپٹن علی نے اپنے اُن خطوط میں کیا جو سیاچن تعیناتی کے دوران اُنہوں نے اپنے والدین کو لکھے ۔ کیپٹن علی نے ایک خط میں لکھا کہ آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ میں نے بھارتی فوج کی ایک چوکی کو کامیابی سے نشانہ بنایا ہے ۔ علاوہ ازیں کتنی ہی بار ریسکیو آپریشن میں حصہ لیا اور مشکل ترین حالات میں اپنے ساتھیوں کو بچایا۔ آپ حاجی پوسٹ پر دو بار تعینات رہے جس کی سطح سمندر سے اونچائی 22000 فٹ سے اوپر بتائی جاتی ہے ۔

یاد رہے کہ بلند ترین پوسٹ پر ایک مقررہ وقت تک قیام رہتا ہے، بعد ازاں بلند پوسٹوں پر

تعینات افسروں اور جوانوں کو نیچے بیس کیمپ میں بلالیا جاتا ہے اور تازہ دم دستے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔کیپٹن علی کو بلند ترین پوسٹ پر اپنی تعیناتی کی مدت ختم کر کے بیس کیمپ واپس آئے ہوئے ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ خضر پوسٹ پر مامور کیپٹن بلال نے اپنی بہن کی شادی میں شرکت کی وجہ سے چھٹی مانگ لی ، اس سے پہلے کہ وہاں کسی اور کی ڈیوٹی لگائی جاتی کیپٹن علی ، خضر پوسٹ پر جانے کے لئے تیار ہو گئے اور پوسٹ کی جانب جلد ہی اپنے ساتھیوں سمیت روانہ ہو گئے، وہ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ بھارتی فوج کی جانب سے گولہ باری شروع ہوگئی ، برف کا ایک طوفان اٹھا اور برفانی تودے یکے بعد دیگرے گرنے لگے ۔ایک ہزار من وزنی تودہ ان پر آ گرا جس سے کیپٹن علی پانچ ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے ۔ یہ 25 جنوری 1999ء کا دن تھا لیکن تابوت میں بند کیپٹن علی شہید نے اپنے والدین کے گھر کے دروازے پر دستک 28 جنوری 1999ء کو دی ۔ بعد ازاں اُنہیں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفنا دیا گیا۔

شہادت سے چند ہفتے پہلے کی بات ہے کیپٹن علی اپنی والدہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ، امی جان ،تصور کریں اگر ٹیلی فون کی گھنٹی بجے اور آپ فون اٹھائیں تو دوسری جانب بات کرنے والا کہے کہ آپ کا بیٹا شہید ہو گیا ہے ، اس کا تابوت آپ کے گھر آ رہا ہے ، اس لمحے آپ پر کیا گزرے گی ۔ یہ سنتے ہی ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہنے لگی بیٹا تم کیسی باتیں کر رہے ہو، بھلا کوئی ماں بھی اپنے بیٹے کی موت کا تصور کرتی ہے ۔کیپٹن علی نے جیب سے رومال نکالا اور ماں کی آنکھوں سے آنسو صاف کر کے بولا ، امی میں ایک شہید فوجی کا تابوت لے کر ایک گاؤں گیا تھا ، وہاں سارے رشتے دار رو رہے تھے لیکن شہید کی ماں خاموش تھی ، وہ بار بار لوگوں کے چہرے دیکھتی اور واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاتی ۔ایک بزرگ نے کہا شاید صدمے سے شہید کی ماں پر سکتہ طاری ہو چکا ہے ، اسے کسی نہ کسی طرح رُلایا جائے ۔ یہ سنتے ہی شہید کی ماں بولی اور کہا مجھے بار بار رونے کے لئے کیوں کہہ رہے ہو ۔میرا بیٹا تو وطن کی حفاظت کرتا ہوا شہید ہوا ہے ، اس نے پورے خاندان میں میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے ۔آپ مجھے رونے کے لئے کہہ رہے ہو ، شہید تو زندہ ہوتا ہے شہادت کا مقام حاصل

کرنا ہمارے خاندان کے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔

وقت گزرتا رہا پھر وہ وقت بھی آپہنچا جب کیپٹن علی شہید کا جسدِ خاکی ایک تابوت میں بند، والدین کی چوکھٹ پر دستک دے رہا تھا، بیٹے کی شہادت کے صدمے میں والدہ نہ جانے کتنے دن بے ہوش رہیں لیکن بہادر باپ (کرنل سردار عبدالرؤف خان مگسی) نے اتنا ہی کہا کہ شہادت کی تمنا تو میری تھی، میرا بیٹا کیپٹن علی مجھ سے بازی لے گیا۔ بعد از شہادت کیپٹن علی رؤف مگسی شہید کو تمغۂ بسالت سے نوازا گیا۔

فخرِ بلوچستان لیفٹیننٹ میر جہانگیر خان مری

شہید (ستارۂ بسالت)

شہید لیفٹیننٹ میر جہانگیر مری کے بھائی عالم زیب مری کی ایک تحریر

لیفٹیننٹ میر جہانگیر مری شہید بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ شاید اسی لئے شفقت اور احساسِ ذمہ داری جیسے اوصاف آپ کی شخصیت میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ وہ 4 ستمبر 1984 کو بلوچستان کے ضلع کوہلو میں پیدا ہوئے۔ کوہلو سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تعمیرِ نو پبلک سکول کوئٹہ میں انٹرمیڈیٹ کے لئے داخلہ لیا۔ وہ ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں رہائش پذیر تھے جس میں چند گریجویشن کے طلباء بھی شامل تھے لیکن جہانگیر کی قائدانہ صلاحیتوں کی بناء پر ہاسٹل انچارج انہی کو بنایا گیا۔

انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد پاکستان آرمی میں شمولیت کی غرض سے آئی ایس ایس بی کے لئے اپلائی کیا۔ پاکستان آرمی میں کمیشن کے تمام ذہنی وجسمانی امتحان کامیابی سے مکمل کرنے کے بعد آنکھوں کی بیماری کی وجہ سے میڈیکل بورڈ نے مسترد کر دیا لیکن پھر بھی ہمت نہ ہاری اور آنکھوں کا آپریشن کروایا اور دوسری کوشش میں سلیکٹ ہو گئے۔ دو سالہ عسکری تربیت حاصل کرنے کے بعد 34 بلوچ رجمنٹ (الضرار بٹالین) میں تعینات ہوئے جو اِس وقت باجوڑ ایجنسی میں برسرِ پیکار تھی جہاں آپ نے دہشت گردوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ آپ کی قابلیت کے پیشِ نظر کمانڈنگ آفیسر نے آپ کو نئے بھرتی ہونے والے ریکروٹس کی ٹریننگ کا فریضہ سونپ دیا جو آپ

نے بطریق احسن نبھایا۔مہمند ایجنسی میں افواج سے بٹالین لنک اپ کرنے کے آپریشن میں بھی آپ پیش پیش رہے اور دہشتگردوں کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا۔ آپریشن شیر دل کے دوران ''زگہ ڈھیری'' کا علاقہ دہشت گردوں سے پاک کرنے میں آپ شر پسندوں کے بھاری ہتھیاروں کی زد میں آگئے۔اتنے مشکل حالات کے باوجود ثابت قدم رہے اور انتہائی چابک دستی سے دشمن کے وار کا منہ توڑ جواب دیا اور بے مثال بہادری، مہارت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا عملی نمونہ پیش کیا۔ اس کارروائی میں شر پسندوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔شر پسندوں کے دو کمانڈر طالب اور شیر جان جہنم واصل ہوئے اور بھاری ہتھیاروں کا ایک ذخیرہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔آپ کی بے مثال بہادری کے سبب کمپنی اپنے ہدف کو حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ 2 جولائی 2009 تک 34 بلوچ رجمنٹ نے چنار تک کا علاقہ عسکریت پسندوں سے پاک کرلیا۔اب شر پسندوں نے جنوب مغرب کی طرف سے 500 میٹر کے فاصلے پر موجود ایک ٹیکری سے کمپنی کے علاقے اور گاڑیوں کو نشانہ بنانا شروع کرلیا یہ ایک انتہائی خطرناک صورتِ حال تھی۔اس سے نمٹنے کے لئے کمپنی کمانڈر نے ایک پلاٹون گشت تیار کرلی۔لیفٹیننٹ جہانگیر اس پلاٹون کا حصہ نہ تھے لیکن آپ کے بے حد اصرار پر آپ کو اجازت مل گئی۔ 10 جولائی جمعۃ المبارک کے دن آپ صبح سویرے اپنے جوانوں کے ہمراہ ہدف کی جانب روانہ ہوگئے۔آگے جا کر معلوم ہوا کہ یہ دہشت گردوں کا ٹھکانہ ہے۔آپ نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اچانک چھپے ہوئے دشمن نے آپ پر اندھا دھند فائر کھول دیا۔آپ نے ثابت قدمی سے دشمن کے وار کو روکے رکھا اور جوابی کارروائی کرتے رہے۔توپ خانہ اور ٹینکوں کے فائر کرانے کی بدولت دہشت گردوں کے ٹھکانے تباہ ہوئے اور انہیں بھاری نقصان پہنچا۔ دہشت گردوں نے بھاری نقصان اٹھانے کے بعد پسپائی اختیار کی۔اس دوران دوسری طرف سے انہیں ملحقہ علاقوں مانوگئی اور ہاشم سے بھاری رسد اور کمک بھی مل گئی۔دہشت گردوں نے آپ کی پلاٹون پر بے تحاشا راکٹ اور چھوٹے ہتھیاروں سے حملہ کیا ایک ٹینک پر راکٹ لگنے کی وجہ سے دو جوان شدید زخمی ہوئے۔اس مشکل صورتِ حال کے دوران بھی آپ نے اپنے حواس پر قابو رکھا

اور کمال استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے فائر کا جواب دیتے رہے۔ آپ نے چھپے ہوئے دشمنوں کے ٹھکانوں کی نشاندہی کی اور ان پر مارٹر کا فائر کروایا جس سے کئی عسکریت پسند جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ انہیں اپنی پوزیشن سے بہت قریب شر پسندوں کا ایک چھپا ہوا گروہ نظر آیا اور آپ نے انہیں پکڑنے کی ٹھان لی اور اپنی پلاٹون کی پیش قدمی شروع کر دی اور اچانک ان پر ہلہ بول دیا۔ دہشت گردوں نے مزاحمت کی اور شدید فائرنگ کا تبادلہ شروع ہوا۔ آپ نے ارد گرد چھپے ہوئے دہشت گردوں کو الجھائے رکھا اور ان پر راکٹ فائر کئے۔ چھپے ہوئے دہشت گرد آپ کے حملے کی تاب نہ لاسکے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ آپ نے جوانوں کو حکم دیا کہ بھاگتے دہشت گردوں میں سے کوئی بچ کر نہ جانے پائے۔ اس جرأت مندانہ اقدام کے نتیجے میں مزید دو دہشت گرد جہنم واصل ہوئے اور دو شدید زخمی ہو کر گر پڑے۔ اسی اثناء میں دہشت گردوں کے فائر کی ایک بوچھاڑ آپ کے سینے، گردن اور بازو کو چھلنی کر گئی آپ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے زمین پر گر پڑے۔ آپ سے تھوڑی دور ہی نائب صوبیدار، خدا بخش بھی زخمی ہوئے اور اپنے کمانڈر کو گرتا دیکھ کر آپ تک پہنچے۔ آپ کے منہ سے آخری الفاظ نکلے خدا بخش ان کو چھوڑ نا مت اور اپنا کام جاری رکھیں اس کے ساتھ ہی آپ جان جانِ آفریں کو سونپ کر شہیدوں کی صف میں کھڑے ہو گئے اور بارگاہِ خداوندی میں سُرخرو ہوئے۔

11 جولائی کی صبح آپ کی میت کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے دادعلی شہر (جہانگیر آباد) کو بلوایا گیا۔ پورے ضلع کی تاریخ میں اتنی بڑی نمازِ جنازہ ابھی تک کسی کی نہیں ہوئی۔ آپ کو مکمل فوجی اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔ الیکٹرونک میڈیا نے آپ کے جنازے کی لائیو کوریج کی جبکہ پرنٹ میڈیا میں بھی آپ کی شہادت کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں۔

لیفٹیننٹ میر جہانگیر خان مری شہید نے ملکی دفاع کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کر کے ثابت کیا کہ بلوچ پاک سرزمین کے لئے جانوں کی قربانی سے کبھی دریغ نہیں کریں گے۔ لیفٹیننٹ جہانگیر خان مری کی شہادت کو تقریباً 10 سال کا عرصہ مکمل ہونے کو ہے لیکن آج بھی آپ پاکستانی عوام کے

دلوں میں زندہ ہیں۔ صدرِ مملکتِ پاکستان نے بے مثال بہادری اور قربانی پر آپ کو (بعداز شہادت) ستارۂ بسالت کے اعزاز سے نوازا۔ اس کے علاوہ مختلف تعلیمی ادارے، سڑکیں اور صحت کے مراکز آپ کے نام سے منسوب ہیں جبکہ حکومتِ بلوچستان نے کوہلو کی ایک یونین کونسل بھی آپ کے نام سے منسوب کی ہے جو بلاشبہ آپ کی خدمات اور اُن قربانیوں کا اعتراف ہے جو آپ نے پاک سرزمین کی حفاظت کے لئے انجام دی ہیں۔

شہادت کا تاج

محمد عمران

شہید کیپٹن عاقب جاوید ولد جاوید محمود موضع نوتھیں تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے سے حاصل کی۔ سکول و کالج میں اساتذہ سے اپنے ان ہیروز کے بارے میں جاننے کا موقع ملا، جنہوں نے وطن کی خاطر جانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے اپنے سینوں کی ڈھال بنا کر عوام کو محفوظ رکھا۔ عاقب جاوید کے دل میں بھی فوج جوائن کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ دل میں وطن کی خاطر کچھ کرنے کی لگن تو بچپن ہی سے موجود تھی، مگر جب یہ لگن جنون میں بدل چکی تو اسے منزل تک پہنچانے کے لئے انہوں نے افواجِ پاکستان کا حصہ بننے کے لئے دل جمعی سے محنت کی۔

عاقب جاوید کو وردی سے محبت اپنے گھر سے ملی، ان کے والد پاکستان نیوی سے لیفٹیننٹ کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے، عاقب جاوید کے والدِ گرامی نے بھی بیٹے کی اس محنت کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے اس کا ساتھ دیا، لیکن دل میں ایک وسوسہ ہمیشہ سے رہا کہ ایسا بچہ جو عام بچوں سے مختلف ہے۔ جو ہر وقت صرف اپنی ہی دنیا میں گم رہتا ہے، عام بچوں والی حرکتیں نہیں کرتا، شرارتوں سے تو ایسے دور بھاگتا تھا جیسے اس کی صحت پر گراں گزریں گی۔ حالانکہ شرارتیں ہی بچوں کے لئے اچھی سمجھی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جو بچے زیادہ شرارتی ہوتے ہیں، ان میں سیکھنے کی صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں۔

جبکہ عاقب جاوید کے ساتھ ایسا کچھ نہیں تھا وہ بس چپ چاپ رہتے تھے، ہم عصر ساتھیوں سے الگ تھلگ تھے، جیسے کہ بچوں میں کوئی بڑا آدمی بیٹھا انہیں زندگی جینے کے رموز بتا رہا ہو۔ اسی

خاصیت کے بدولت انہیں بچپن سے ہی الگ مقام حاصل تھا۔ بڑے بزرگ اُن کے اس رویے کو پسند کرتے تھے کہ کتنا فرمانبردار بچہ ہے۔ جب کبھی بھی گاؤں کے بزرگوں کی بیٹھک ہوتی نئی نسل کی تربیت کا تذکرہ ہوتا تو عاقب کا تذکرہ ضرور ہوتا اور سب ہی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ شرافت کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہی گھر میں داخل ہونے سے پہلے دروازہ کھٹکھٹانا نہیں بھولتے تھے۔

ماں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ مگر اس میں بھی حجاب، لجا اور احترام کا دامن کبھی نہیں چھوڑا، گھنٹوں بیٹھ کر ان کے ساتھ مستقبل کی باتیں کرتے رہنا تو معمول تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ ماں بیٹا نہیں کوئی دو سہیلیاں بیٹھ کر اپنے دکھ سکھ کی باتیں کر رہی ہوں، ماں بھی بیٹے سے اتنا ہی پیار کرتی تھیں، ہر وقت ان کی سلامتی کی دعائیں مانگتیں، ان کی ہر پسند ناپسند کا خاص خیال رکھا کرتی تھیں، انمول ہیرے سے تشبیہہ دیا کرتی تھیں۔ ماں بیٹے کے پیار کو پورے خاندان میں مثال سمجھا جاتا تھا، وہ ہمیشہ اپنے بھائی اور بہن کے ساتھ بھی یہی پیار روا رکھتے تھے۔ اُنہیں بتاتے کہ بڑوں کے ساتھ کیسے پیش آنا چاہیئے، چھوٹوں کا خیال کیسے رکھنا چاہیئے، ماں باپ اور گاؤں کے بزرگوں کے لئے ہم پر کیا فرائض ہیں۔

ایک بچہ ایسی باتیں کیا کرتا تھا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی تھیں، نجانے ایسا کون سا خواب دل میں لئے بیٹھے تھے کہ اپنے علاقے کے لئے سوچتے تھے کہ کس طرح میں اپنے لوگوں کے کام آسکتا ہوں۔ کس طریقے سے ان کی امداد کرسکتا ہوں، ان کے معیار زندگی کو کیسے بلند کر سکتا ہوں، اپنی عمر سے بڑھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ بزرگ کہتے کہ اس کے اندر تو کوئی بہت ہی پرانی روح سرایت کر چکی ہے۔ شاید قدرت بھی جن کی قربانی پسند کرتی ہے ان کی تربیت ایسے روپ میں کرتی ہے کہ انہیں منزل تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ جس منزل کے وہ مسافر ہیں اس تک بغیر کسی پریشانی کے پہنچ پائیں۔

قدرت اسی لئے ہر کام میں آسانیاں پیدا کر رہی تھی۔ سب کچھ جلدی جلدی طے پا رہا تھا۔ بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 2015ء میں 132 لانگ کورس میں سیلیکٹ ہونے کے بعد عاقب جاوید

پی ایم اے کاکول میں اپنے خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے پہنچ گئے۔ جہاں پر ان کی صلاحیتوں کو قابل اساتذہ نے مزید نکھارا۔ جسمانی، ذہنی اور پیشہ وارانہ تربیت حاصل کرنے کے بعد 131 ایس پی میڈیم رجمنٹ میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے لگے۔ جلد ہی اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر انہوں نے افسروں اور جوانوں میں اپنی الگ پہچان بنالی۔ جوانوں کے ساتھ گھل مل جانا معمول کی بات تھی، کبھی احساس نہیں ہونے دیتے تھے، کہ وہ افسر ہیں اور جوان اُن کے ماتحت ہیں، ہمیشہ ان کے چہرے پر سنجیدہ مسکراہٹ ہوتی تھی، جس سے وہ سب کو ہی اپنا گرویدہ بنالیا کرتے تھے۔ نوجوان افسر ہونے کی وجہ سے کھیلوں میں بھرپور حصہ لیا کرتے تھے اور یونٹ کو نمایاں مقام دلوانے میں اپنا اہم کردار ادا کیا کرتے۔

بیٹا جہاں ترقی کی منازل طے کر رہا تھا، تو والدین خاص طور پر والدہ شادی کے لئے تیاریاں کر رہی تھیں کہ جلد سے جلد بیٹے کے لئے چاند سی دلہن لاؤں۔ بہن بھائی بھی گھر میں بھابھی کی آہٹ سننے کے لئے منصوبہ بندی میں برابر شریک ہوتے تھے۔ پورا خاندان ہی کیپٹن عاقب جاوید کی شادی کے لئے بھرپور تیاریاں کر رہا تھا۔

ماں اپنے خیالوں میں گم رہا کرتی تھیں۔ انہیں جلدی تھی کہ کب ان کے بیٹے کے سر پر سہرا سجے گا۔ جس کے لئے وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دن رات تیاریوں میں مصروف تھیں۔ ان کی دلہن کے لئے شاپنگ کے لئے جاتیں، پھر نجانے کیا ہوتا بدلنے چل پڑتیں کہ ایسا نہ ہو کہ میرے بیٹے کو پسند نہ ہو۔ بار بار بدلتی کہ میرے عاقب کی دلہن کے لئے کسی طرح کی کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔ ان کے پاؤں خوشی سے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ گاؤں کی خواتین سے ہر روز مبارک بادیں وصول کر کے خوش ہوتیں۔

بہن، بھائی نے شادی کی رسموں کی ایک لمبی فہرست شہید کیپٹن عاقب جاوید کے ہاتھوں میں تھما دی تھی کہ ہمیں فوجی ڈسپلن کی قید میں جکڑ کر ان سے جان چھڑانے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ یہ نہ ہو کہ ہم پر حکم صادر کر دیں کہ تم فلاں قانون کے تحت یہ رسم انجام نہیں دے سکتے ہو۔ بھائی

کی شفقت ایک بار پھر معصوم پیار سے لبریز خواہشوں کے سامنے بے بس نظر آئی، لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا لگتا یوں ہے کہ یہ دن تو میری قید اور غلامی کا ہے، ہر کوئی مجھے پوچھ کم اور بتا زیادہ رہا، کہ ہم ایسے کریں گے تم بس چپ چاپ کر کے سر ہلاتے رہنا، بہن نے روٹھتے ہوئے کہا ٹھیک ہے بھائی ہم کچھ نہیں کریں گے، پگلی میں تو مذاق کر رہا ہوں، ارے میں بھی تو مذاق کر رہی تھی، قدرت بھی دیکھ رہی تھی کہ کیا منصوبے بنائے جا رہے ہیں، جبکہ میرا منصوبہ تو کچھ اور ہی ہے جو ان سب پر بھاری ہوگا، اور اسی پر عمل بھی ہوگا، جس پر دنیا اَش اَش کر اٹھے گی، جس بچے نے علاقے کا نام روشن کرنے کا سوچا تھا اس کی اس معصوم خواہش کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

کیپٹن عاقب جاوید جو کہ رواں سال اپریل 2019ء سے بلوچستان ایف سی میں تعینات تھے، جہاں دشمن کئی دہائیوں سے تاک لگائے بیٹھا ہے، کبھی کسی صورت تو کبھی کسی صورت میں سامنے آتا رہتا ہے۔ جہاں سے انڈین نیوی کا حاضر سروس کمانڈر بھی پکڑا گیا ہے، جو بلوچستان میں دہشت گردانہ کارروائیاں کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا، تاکہ دہشت پھیلا کر بلوچی عوام کو ترقی سے دور رکھا جا سکے۔ گوادار جو پاکستان کا مستقبل ہے اسے سبوتاژ کیا جا سکے۔ لیکن ہمارے جوان، افسر دشمن کے ہر منصوبے کو ناکام بنانے کے لئے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہیں۔ ایسے ہی ان دیکھے دشمن کے خلاف انٹیلی جنس بنیاد پر تربت میں آپریشن کیا جا رہا تھا، جس کی کمانڈ کیپٹن عاقب جاوید کر رہے تھے۔ بہادر سپہ سالار کی طرح سب کو لیڈ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اسی اثناء میں چھپ کر وار کرنے والے بزدلوں نے ان پر اندھا دھند فائرنگ کر دی اور وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہادت کے عظیم رتبے پر فائز ہو گئے۔ انہوں نے ماں کے کہے ہوئے ان الفاظ کو نبھا دیا کہ بیٹا تم جن عظیم لوگوں میں جا رہے ہو، ان کی شاندار روایات ہیں۔ کبھی کسی نے گولی پیٹھ پر نہیں کھائی، اگر کبھی ایسا موقع آیا تو تم بھی اس دھرتی کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے والوں کی طرح اپنا سینہ پیش کرنا، تاکہ جو سیسہ پلائی دیوار دشمن کو ناکام بناتی ہے اس میں قوم کے ایک اور بیٹے کی چھاتی جڑ سکے، اور یوں شہید کیپٹن عاقب جاوید نے ماں کے الفاظ کو حکم جانتے ہوئے دشمن کی گولیوں کے

سامنے اپنا سینہ پیش کر کے شہیدوں کی روایات کو قائم رکھا۔ جس سر پر سہرا اور جسم پر شیروانی سجانے کے لئے تیاریاں تھیں اس سر پر شہادت کا تاج اور جسم پر ملک سے محبت کی پوشاک پہن کر ہمیشہ کے لئے زندہ رہنے والی دنیا میں جا بسا۔

دشمن کئی دہائیوں سے اس کوشش میں ہے کہ بلوچستان کی غیور عوام کو پنجاب کے خلاف بھڑکا کر ان کے خلاف استعمال کیا جائے۔ ایسا لگے کہ بلوچی پنجابیوں کا قتل عام کرتے ہیں، تاکہ نفرتوں کی آگ کو دہکا کر اپنے مذموم مقاصد حاصل کئے جا سکیں، جبکہ شہادتیں تمام طرح کے ہتھکنڈوں کی نفی کر دیتیں ہیں۔ صوبہ پنجاب کے ایک افسر نے اپنے بلوچی بھائیوں کی حفاظت کے لئے اپنی جان کی پروا کئے بغیر دشمن کی گولیوں کا سامنا کیا تاکہ بلوچستان سے ایسے افراد کا صفایا کیا جائے جو ہمیں آپس میں لڑانے کی تگ و دو میں ہیں۔ ہر شہادت دشمن کو واضح پیغام دیتی ہے کہ تم جتنے بھی منفی ہتھکنڈے استعمال کر لو ہم اپنے خون سے انہیں صاف کر کے نئی منزلوں کے راستوں میں متحد ہو کر اپنے ملک کو دنیا کے اہم ممالک کی صف میں کھڑا کریں گے۔ جس کے لئے چمکتی آنکھوں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ کیپٹن عاقب جاوید نے 26 جولائی 2019ء کو جام شہادت نوش کیا۔ 27 جولائی 2019ء کو شہید کیپٹن عاقب جاوید کو شاندار فوجی روایات کے مطابق تمام اعزازات کے ساتھ دفن کیا گیا، جیتے جی بھی اپنے ہم عصروں اور گاؤں والوں کے لئے مثال تھے، اور شہادت کا رتبہ حاصل کر کے نہ صرف والدین بلکہ علاقے کا نام روشن کر کے ہمیشہ کے لئے دعاؤں اور دلوں میں زندہ و جاوید ہو گئے۔

معرکہ گنڈا سنگھ کا فاتح اور میاں جی

بریگیڈیر غلام حسین چیمہ (ر) تمغہ جرأت کی شجاعت آمیز داستان

طارق سجاد اشرف کے قلم سے

میاں جی کے شاگردوں میں فضل حسین اور غلام حسین سب سے زیادہ ذہین، پھرتیلے اور باہمت لڑکے تھے۔ غلام حسین تو اپنے لمبے قد، چھریرے جسم اور ستواں ناک کی وجہ سے دیومالائی شہزادہ دکھائی دیتا تھا۔ مسجد میں قرآنی قاعدہ پڑھنا ہو یا سکول میں قلم دوات سے تختی لکھنی ہو، چوہدری کرم داد چیمہ کے دونوں بیٹے پیش پیش ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں بھائی میاں جی کے سب سے زیادہ قریب تھے اور ان کی خدمت بجالانے میں بھی پیش پیش رہتے تھے اور جب سے میاں جی نے دونوں بچوں کی ناک دیکھ کر یہ پیش گوئی کی تھی کہ یہ بڑے ہو کر فوجی افسر بنیں گے، تب سے انہوں نے میاں جی سے کچھ زیادہ ہی سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ چلتے پھرتے فوجی پریڈ کرتے اور اپنے ساتھی دوستوں کو ماتحت بنا کر جلدی چل، داہنے مڑ، پریڈ رک۔۔۔ کے کاشن دیتے رہتے۔ پھر میاں جی سے مکرر پوچھتے بھی رہتے: میاں جی، میں فوجی افسر بنوں گا نا؟ اور میاں جی کہتے: ہاں بیٹا! جن کے ارادے پختہ ہوں وہ ضرور اپنی منزل پا لیتے ہیں۔

میاں جی محمد دین خود بھی ایک شاندار ماضی رکھتے تھے۔ ہائی سکول کنجاہ اور زمیندارہ کالج گجرات سے فارغ التحصیل تھے۔ گاؤں میں ہی نہیں بلکہ پورے علاقے میں ان سے زیادہ پڑھا لکھا کوئی نہیں تھا۔ فر فر انگریزی بولتے تھے۔ سابق صدر فضل الٰہی چوہدری ان کے کلاس فیلوز میں سے تھے۔ کھیل کے میدان میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ 6 فٹ قد اور 46 انچ چوڑی چھاتی کے ساتھ

محمد دین جب ہاکی کھیلنے میدان میں اترتے تو دنیا دیکھ کر رشک کرتی۔فل بیک پوزیشن پر کھیلتے ہوئے وہ مخالف ٹیم کی گیند اپنی ڈی تک مشکل سے آنے دیتے تھے اسی لئے اِن کا نام ہمالیہ پڑ گیا۔ ملایا میں جب جاپانیوں کے ساتھ جنگ کے لئے انگریزی فوج میں بھرتیاں ہو رہی تھیں تو قوی الجثہ محمد دین کو بھی سلیکٹ کرلیا گیا۔مگر پیچھے گاؤں چک 23 شمالی میں ان کے والد محترم جناب جلال الدین گوندل انتقال فرما گئے۔لہٰذا انہیں واپس آنا پڑا۔

پاکستان بن گیا تو مہاجرین کے کئی خاندان بھی گاؤں لا کر بسائے گئے۔اس طرح میاں جی محمد دین پاکستان کے جذبے اور نئی منزل کے لئے ولولے سے سرشار ہو کر مہاجرین کی آبادکاری، فلاح و بہبود اور تعلیم میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔انہوں نے جہاں اپنا گھر اور گھر کا سامان ان کو دے دیا، وہاں اپنے گھر کا بڑا حصہ بچوں اور بچیوں کے سکول کے لئے مختص کر دیا۔فضل حسین اور غلام حسین بھی اسی سکول میں ان کے شاگرد تھے، جہاں وہ مخصوص پیریڈ میں بچوں کی فوجی طرز پر جسمانی تربیت بھی کرتے تھے۔وہ تو سزا بھی ایسی دیتے جس سے جسم پختہ ہوتا۔

لیکچر کے دوران میاں جی بچوں کو فوج میں بھرتی ہو کر ملک کی خدمت اور کشمیر کو آزاد کرانے کی ترغیب دیتے تھے۔اسی لئے بڑے بھائی فضل حسین نے جلد ہی پاکستان آرمی میں کمیشن حاصل کرلیا۔غلام حسین لفٹینی کے لئے امتحان پاس نہ کر سکا تو یہ سوچ کر کہ گاؤں جا کے میاں جی کو کیا منہ دکھائے گا، آرمی ریکروٹمنٹ سنٹر جا کر سیدھا سپاہی بھرتی ہو گیا۔ٹریننگ کے بعد گاؤں چھٹی آیا تو سیدھا میاں جی کے پاس حاضر ہوا۔لمبا کاشن دے کر ٹھک سے سیلوٹ مارا۔میاں جی نے اٹھ کے گلے لگا لیا۔اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولے، غلام حسین تو بڑا افسر بننے کے لئے پیدا ہوا ہے، جب یونٹ واپس جاؤ تو اپنے سی او صاحب کے لئے میری چٹھی لے جانا میاں جی سارے گاؤں والوں کو چٹھیاں لکھ کے دیتے تھے۔بھرتیاں کھلتیں تو وہ نوجوانوں کو اتنا خوبصورت مضمون باندھ کے دیتے کہ افسر پڑھ کر سرشار ہو جاتے، درخواست فوراً قبول ہو جاتی۔اسی لئے تو 23 شمالی گاؤں میں سب سے زیادہ لوگ فوج میں ملازم ہیں اور ان میں بھی زیادہ تعداد فوجی افسران کی ہے۔یہ سب میاں

جی کا کرشمہ تھا۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ بندے کی خودی اور ذاتی حمیت کو جگا دیتے تھے۔غلام حسین جب میاں جی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹھی لے کر اپنے سی او کے پاس پہنچے تو کرنل صاحب بہ نفس نفیس اٹھ کر باہر آ گئے اور چٹھی بآواز بلند پڑھنا شروع کر دی۔میاں جی نے لکھا تھا: کرنل صاحب، ہمارا غلام حسین افسر بننے کے لئے پیدا ہوا تھا، آپ نے اسے سپاہی بنا دیا ہے۔؟ مہربانی فرما کر اسے کمیشن کے لئے تیاری کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔اس جذبے اور تربیت پر کرنل صاحب اش اش کر اٹھے۔

پھر کیا ہوا، 1960ء میں 9ویں او ٹی ایس شارٹ کورس کے ذریعے کمیشن لے کر غلام حسین چیمہ لفٹین بن گئے۔ 1965 کی جنگ شروع ہوئی تو کیپٹن چیمہ کی یونٹ چھمب جوڑیاں تعینات تھی۔ فوجی جوانوں، افسروں اور پوری قوم کا جذبہ دیدنی تھا۔گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔عین اس وقت کپتان صاحب کے اردلی نے میاں جی کی ارسال کی ہوئی چٹھی ان کے ہاتھ پر رکھ دی۔کھولی تو چہرہ خوشی سے کھِل اُٹھا۔اپنے جوانوں کو بآواز بلند پڑھ کر سنا دی۔اس میں لکھا تھا، میرے شیر! میں جانتا ہوں تم پیٹھ نہیں دکھاؤ گے، زندگی اور موت اللہ کی امانت ہے۔آگے بڑھو اور دشمن کو تہس نہس کر دو۔اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔جنگ ختم ہوئی۔کپتان صاحب چھٹی آئے تو خود بتایا: چٹھی پڑھنے کے بعد یوں لگا جیسے میاں جی خود میرے ساتھ ساتھ ہیں، میرے جنون کی حد رہی نہ حساب، میں اور میرے جوان اس بے جگری سے لڑے کہ دشمن کو نہ صرف بھاری مالی و جانی نقصان پہنچایا بلکہ ہم نے دشمن کے بہت سارے علاقے پر قبضہ بھی کر لیا۔

دونوں بھائی گاؤں آئے تو علاقے کے لوگوں نے فقید المثال استقبال کیا۔فضا نعرۂ تکبیر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونجتی رہی۔میاں جی نے کہا، میرا شیر بڑا تمغہ لے گا، اور جلد ہی لے گا۔اور وہ وقت بھی جلدی آ گیا۔میجر غلام حسین چیمہ کی یونٹ 9 پنجاب اس وقت گنڈا سنگھ میں تعینات تھی جب 1971 کی جنگ شروع ہوئی۔گنڈا سنگھ، حسینی والا سے متصل تھا جہاں قیصر ہند کی تاریخی عمارت کے قریب بہت بڑا معرکہ لڑا گیا تھا۔کرنل حبیب احمد نے اپنی معروف کتاب دی بیٹل آف

حسینی والا اور قیصرِ ہند میں 106 بریگیڈ کی کمان میں لڑنے والی 41 بلوچ، 9 پنجاب اور دیگر یونٹوں کا آنکھوں دیکھا حال رقم کیا ہے۔اس میں انہوں نے دیگر بہادر سپوتوں کے علاوہ میجر غلام حسین چیمہ کی شجاعت و بہادری کا قصہ بھی گویا سنہری حروف سے لکھا ہے۔میجر چیمہ نے دشمن کے کئی مورچے تباہ کئے اور کئی دشمن واصلِ جہنم کیے۔وہ چیتے کی طرح لپکتے اور آگے بڑھتے رہے۔ان کے سینئر ان کو اپنی حفاظت کی بھی تلقین کرتے رہے مگر جواں مردی اور جنون کا حسین امتزاج میجر حسین کو معرکۂ حسینی والا میں رسمِ حسینی رقم کرنے پر اکساتا رہا۔آج معرکہ حسینی والا اور گنڈا سنگھ کے فاتحین میں میجر حسین کا نام سرِفہرست آتا ہے۔اسی معرکے میں ان کے ہم نام کرنل غلام حسین جن کا تعلق للیانی ضلع سرگودھا سے تھا، بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے جن کو ہلالِ جرأت عطا کیا گیا اور میجر چیمہ کو تمغۂ جرأت سے نوازا گیا۔یوں میاں جی کی پیش گوئی بھی پوری ہوگئی۔

گاؤں آ کر میجر غلام حسین نے خود معرکہ حسینی والا اور گنڈا سنگھ کی تفصیلات بیان کیں تو پورے گاؤں کو اِک ولولۂ تازہ ملا۔جب گولیوں کی بوچھاڑ میں دشمن کے ایک مورچے پر جو اولیکے کی پوسٹ پر واقع تھا، میں نے تن تنہا دھاوا بول دیا تو مورچے پر کھڑے ہو کر میں نے گرینیڈ کی پن نکال دی، اندر پھینکنے لگا تو دشمن کے سپاہی ہاتھ باندھ کے کرپا کرو مہاراج، دیا کرو مہاراج کی التجائیں کرنے لگے۔وقت بہت ہی کم تھا گرنیڈ کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا، میری نظروں میں میاں جی کا ہنستا ہوا شفیق چہرہ گھوم گیا۔میں نے معاً گرنیڈ مورچے کے دوسری طرف پھینک دیا اور مورچے میں موجود دشمن کے سپاہیوں کو قیدی بنانے کی غرض سے حکم دیا کہ وہ ایک ایک کر کے باہر نکل آئیں۔جب پہلا آدمی باہر نہیں نکل سکا تو اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا تاکہ میں باہر آنے میں اس کی مدد کروں۔جونہی میں نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔دشمن کے سپاہی خود باہر آنے کے بجائے مجھے اندر کھینچنے کی کوشش کرنے لگے۔مجھے شدید غصہ آ گیا، نہ جانے میرے اندر اتنی قوت کہاں سے آ گئی۔میں نے اپنی کمر پر سارا بوجھ ڈال کے ایک ہی جھٹکے سے خود کو چھڑوا لیا۔چالاک دشمن نے مجھے دھوکہ دیا تھا اور اب وہ رحم کا ہرگز مستحق نہیں تھا۔میں نے

جی تھری گن کی ساری میگزین خالی کر دی اور مورچے میں موجود دشمنوں کا صفایا کر دیا سننے والے جو اب تک سنسنی خیز واقعے پر دم بخود بیٹھے تھے، یک بارگی پاک فوج زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگانے لگے۔ نوجوانوں نے میجر غلام حسین کو کندھوں پر اٹھا لیا اور جلوس کی شکل میں میاں جی کے دروازے پر آ رُکے۔ میاں جی نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگا لیا۔ ماتھا چوم کر کہا: بیٹا، جو پاکستان کے لئے قربانی دیتا ہے، اللہ اس کا اقبال بلند کرتا ہے۔

میاں جی 3 اگست 1983 کو انتقال کر گئے۔ فضل حسین نے کرنل کے عہدے تک ترقی پائی اور ریٹائرمنٹ کے بعد جلد ہی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ غلام حسین چیمہ بریگیڈیئر بن کر ریٹائر ہوئے بلکہ بعض وجوہات کی بنا پر قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ مگر اقبال بلند ہونے کی دعا ابھی پورا ہونا تھی۔ جلد ہی اہل علاقہ کے وفود آنا شروع ہو گئے انہوں نے بریگیڈیئر غلام حسین کو ان کی سیاسی نمائندگی پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح وہ اولاً ضلع کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور بعد ازاں ممبر نیشنل اسمبلی کا انتخاب جیت گئے۔ بحیثیت کونسلر اور ایم این اے انہوں نے تھوڑے عرصے میں بے شمار فلاحی کام کروائے، گاؤں میں پینے کے صاف پانی کا دیرینہ مسئلہ حل کروایا، سولنگ لگوائی۔ اس پر مستزاد، گاؤں میں نہایت خوبصورت مسجد کی تعمیر اِن کا بڑا کارنامہ ہے۔

بریگیڈیئر چیمہ کچھ عرصے سے چاہنے والوں کی درخواست پر اپنی یادداشتیں جمع کر رہے تھے۔ ان کی اپنی تحریر کردہ سوانح حیات اگر مرتب ہو جاتی تو یہ عسکری تاریخ کا زریں باب ہوتا۔ مگر قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ پچھلے ماہ 10 محرم الحرام دن 12 بجے قوم و ملک کا یہ بہادر سپوت خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ آپ کے اندر شہادت کا رتبہ پانے کا شدید جذبہ تھا، مگر ایک غازی مجاہد کی زندگی کا اختتام جناب امام عالی مقام حضرت امام حسینؑ کی عظیم الشان شہادت کے دن، چیمہ خاندان کے لئے ایک اور سعادت کا سبب بن گیا۔

بریگیڈیئر صاحب نہ صرف ہمارے گاؤں، علاقے اور ضلع بھر کا فخر تھے بلکہ پاک فوج اور پاکستان کا قیمتی اثاثہ تھے۔ ان کی کامیابیوں کے پیچھے والدین، بالخصوص میاں جی مرحوم جیسے شفیق

اساتذہ کی تربیت اور روحانی فیض کارفرما رہا۔چھمب جوڑیاں اور گنڈا سنگھ کی فتوحات میں ان کا کردار کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔قوم کے ان سپوتوں کو معمولی نہ سمجھا جائے، یہ بڑے مہنگے ہوتے ہیں، یہ اپنے بڑوں کی تربیت اور دھرتی کی حرمت کو کبھی نہیں بھولتے۔وقت آنے پر یہ تن کی پروا کرتے ہیں نہ من کی۔اسی لئے تو دشمن ان کی ہیبت اور قوت سے لرزتا ہے۔

داتا نگر فارم سے میران شاہ تک

لیفٹیننٹ کرنل میر باز خان

(مادرِ وطن پر قربان ہونے والے ایک باپ بیٹے کی ایمان افروز داستان)

یہ کیا پاگل پن ہے! طارق تھوڑا پیچھے ہو جا۔۔۔ یہ بی ڈی (Bomb Disposal) والے کا کام ہے کہ وہ آئی ای ڈی (IED) کو ناکارہ بنائے تم کانوائے کمانڈر ہو، اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈال رہے ہو۔

لیکن۔۔۔

۔۔۔کیوں جب آپ نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر داتا نگر فارم میں مورچہ بند دشمن پر ہلہ بولا تھا تو یہ خیال آپ کو کیوں نہیں آیا؟؟؟ کیوں آپ بھول گئے کہ آپ کے دو کم سن بچے اور اور ان کی ماں آپ کے بغیر کیسے گزارہ کر لیں گے۔ کیوں آپ نے نہیں سوچا کہ کپتنی کی کمان بہادری اور بیباکی سے نہیں بلکہ عقلمندی سے بھی ہوتی ہے۔۔۔؟؟؟

۔۔۔بیٹے! میں نے ان حالات میں فرسٹ فرنٹیئر فورس میں قدم رکھا جب ہم نے اپنے سے دس گنا بڑے دشمن کو لاہور، سیالکوٹ اور کھیم کرن کے محاذوں پر ناکوں چنے چبوائے تھے۔ ایک ایسی پلٹن جس میں نئے افسران کو کچھ اس انداز سے تراشا جاتا ہے کہ اپنی ہستی اور ذات بھول کر آدمی اس یونٹ ہی کا ہو جاتا ہے۔ افسری کے اوائل میں وہ ایام مجھے آج بھی یاد ہیں جب میرے بٹالین کمانڈر کہا کرتے تھے کہ اس یونٹ میں کسی کام کو حقیر مت سمجھنا کسی جوان کو اپنی آفیسری صرف اس وقت دکھانا جب مشکل حالات کا سامنا ہو اور جوان آپ کی طرف دیکھ رہے ہوں، اور آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کا امتحان ہو۔ اپنی اور جوانوں کی تربیت سختی اور جذبے کے ساتھ مگر عام حالات میں دوستانہ رویّہ۔ جوانوں کی ویلفیئر اپنی ویلفیئر سے مقدم اور ان کے مسائل کے حل کے لئے بھرپور

کوشش کرنا۔ مگر جب وقت آئے تو اگلی صفوں میں لڑنا اور اپنے جوانوں کے لئے ایک مثال قائم کرنا۔۔۔ ایسے حالات میں میں کیسے پیچھے رہتا۔ کس طرح میں اپنے جوانوں کو حکم دیتا کہ جبن نگر سیکٹر میں مورچہ زن اپنے سے چار گنا بڑے دشمن پر حملہ کرو اور میں عقل اور شعور کے ساتھ پچھلی صفوں میں کمپنی کی کمان کرتا۔۔۔

جبن نگر سیکٹر میں داتا نگر فارم دریائے کوبرک کے نزدیک پانچ سے چھ مربع کلومیٹر ایک جزیرہ نما علاقہ ہے۔ مکتی باہنی والوں نے وہاں پر ایک مضبوط کمین گاہ بنائی ہوئی تھی اور وہیں سے اپنے گوریلا آپریشنز کرتے تھے۔ دریا 200 فٹ چوڑا اور وسط میں 20 فٹ گہرا تھا اور اس کا بہاؤ بھی بہت تیز تھا۔ یہ ایک مشکل آپریشن تھا جو کہ آرٹری امداد کے بغیر ناممکن تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر مکتیوں نے مضبوط مورچے بنائے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ دشمن کے 9 انفنٹری ڈویژن کے جی او سی نے بھی اس آفیسر کو خراج تحسین پیش کیا تھا جس نے اس مشکل آپریشن میں حصہ لیا تھا جس میں کمپنی کمانڈر اور تمام پلاٹون کمانڈروں سمیت پچاس کے قریب جوان کام آگئے تھے اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتنی شدید لڑائی ہوئی ہوگی۔ میجر انیس (شہید) اسی آپریشن میں شہید ہوئے تھے۔ میجر انیس اس وقت مشرقی پاکستان کے محاذ پر 38 ایف ایف رجمنٹ میں کمپنی کمانڈر کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ جبن نگر کے اس حملے میں 22 ایف ایف اور 38 ایف ایف کی ایک کمپنی نے دشمن کی دو بٹالینز پر حملہ کیا تھا جس کے بارے میں انڈین جی او سی میجر جنرل دلبیر سنگھ کے الفاظ تھے 'ہم سمجھے تھے کہ ہماری دو بٹالینز پر شاید پاکستان کی دو بٹالینز نے حملہ کیا ہوگا۔ میجر انیس دشمن کے مورچے سے صرف چار گز کے فاصلے پر شہید ہوئے تھے۔ جنرل دلبیر سنگھ نے میجر انیس کی بہادری اور جرأتمندانہ حملے پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں مکمل اعزاز کے ساتھ دفنایا تھا۔

'مگر طارق بیٹے وہ زمانہ اور تھا وہ وقت کا تقاضا تھا، ہماری پاک دھرتی پر دشمن نے اپنے ناپاک قدم جمائے تھے۔۔ ہمارے اپنے بھائی کچھ ہمارے حکمرانوں کی غلطیوں اور کچھ دشمن کی سازشوں کی بدولت ہماری جانوں کے درپے تھے۔ اس وقت کی کمانڈ اور ابھی کی کمانڈ میں فرق

ہے۔اس وقت بے سروسامانی کے عالم میں ہمارے پاس ایک ہی کارگر ہتھیار تھا۔ بہادری اور بے جگری۔اس دور میں صرف ایک جذبہ ہم سب کو بے سروسامانی کے عالم میں آگے بڑھاتا تھا کہ اپنے علاقے کو ان افراد کے ہاتھوں میں جانے نہیں دینا ہے۔اس دوران ہم نے بڑے بڑے مقاصد کی خاطر اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا گلا گھونٹا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ قبرستانوں میں سجے ہر پرچم کے نیچے ماں کی ممتا، بہن کا مان، بھائی کا فخر، دلہن کے سپنوں کی مہک، اور ہاں اس کے چوبی تابوت پر لپٹے سبز ہلالی پرچم کی خوشبو بھی محسوس کرتا کوئی نوجوان ہونٹوں پر ابدی مسکراہٹ سجائے لیٹا ہے۔ مجھے یہ مسکراہٹ اس لئے بھی اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ یاد ہے کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے، جب بے سروسامانی کے عالم میں وطن کے دفاع کی قسم کھائی تھی، ان تمام ساتھیوں کے ہونٹوں پر یہی مسکراہٹ دیکھی تھی جن کو ہم نے کبھی کسی چیتھڑے میں کبھی کسی سفید کپڑے میں اور کبھی لیکن بہت ہی کم دفعہ، سبز ہلالی پرچم میں لپیٹ کر زمین میں اتارا تھا تو یہی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر تھی، لیکن یہ مسکراہٹ صرف اس وقت نظر آتی جب ان کے سر سالم حالت میں ہمیں ملتے، کیونکہ کئی بار ایسا ہوتا کہ ہم کسی لوتھڑے کو سر سمجھ کر گردن کے ساتھ کسی نہ کسی طرح جوڑ دیتے تو اصل سر کوئی کھائی پھلانگتے وقت ہمیں نظر آتا جسے ہم نظر انداز کرتے کہ اب نہ ہم میں ہمت ہوتی اور نہ وقت کہ ایک سر کی خاطر ہم اپنے اگلے ہدف کو بھول جاتے۔اسی طرح ہم دو کمپنیوں کی مدد سے دشمن کے جدید ہتھیاروں سے لیس دو بٹالینز پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔مگر آپ لوگوں کا زمانہ اور ہے آپ لوگ خوش قسمت ہیں۔آپ کے پاس جدید ہتھیار ہیں، اپنی حفاظت کے آلات ہیں اور آپ کے زیر کمان سپاہی ہنر مند ہیں۔انہیں اپنا کام کرنے دو۔اس جگہ سے پیچھے ہٹ جاؤ۔۔۔

بابا! آج بھی ہمارا وہی دشمن ہے جو ہماری سلامتی کے درپے ہے۔آپ کے زمانے کا دشمن تو مورچہ زن تھا۔سامنے سے حملہ کرتا تھا۔مگر آج اسی دشمن نے حکمتِ عملی تبدیل کر لی ہے وہ ہمارے معاشرے میں گھس کر ہماری سلامتی پر حملے کر رہا ہے۔اس دشمن نے مسجدوں کو بھی نشانہ

بنایا ہے۔انسانوں کو ذبح کرتا ہے۔حتیٰ کہ سکول کے معصوم پھولوں سے لڑتا ہے۔آج بھی خنجراب سے لے کر گوادر تک گمنام مجاہدوں کی قبروں پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہے ہیں۔وادیٔ ہنزہ کے ایک گاؤں کے شہید کا ناتواں باپ جب اپنے جواں سال شہید بیٹے کی میت دیکھ کر کہتا ہے کہ کیا ہوا؟ کیا اس کو میری گود میں موت نہیں آنی تھی؟ میں اپنے باقی چار بیٹے بھی اس دھرتی پر لٹانے کو تیار ہوں۔آج بھی گیاری میں شہید ہونے والے چوک سرور کے ذکا شہید کا والد اپنے بیٹے کی لاش وصول کرتے ہوے اس کے روتے ہوئے کورس میٹس کو دلاسا دیتا ہے کہ میجر صاحب ہمت سے کام لو۔ابو آپ بھول رہے ہیں کہ میں بھی اسی یونٹ کا سپوت ہوں۔۔ یہاں آج بھی مشکل حالات میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ رہنے کا درس دیا جاتا ہے۔آج بھی ہماری تربیت اسی انداز میں ہوتی ہے جیسے آپ لوگوں کی ہوتی تھی۔آج بھی اسلاف یعنی آپ لوگوں کی رقم کی ہوئی تاریخ ہمیں فخریہ انداز میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ پلٹن آج بھی جرنیلوں والی پلٹن کے نام سے پہچانی جاتی ہے اسے جرنیلوں کی نرسری کا نام بھی دیا جاتا ہے۔میں نے بھی اسی میں تربیت پائی ہے۔اور سب سے بڑی بات میری رگوں میں آپ ہی کا خون دوڑ رہا ہے۔میں کیسے اپنے جوانوں کو مشکل کی اس گھڑی میں چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاؤں؟ آپ کی طرح میرے بھی دو ہی بچے ہیں وہی عمریں جو ہماری تھیں۔آپ کی شریکِ حیات اور میری والدہ کی طرح مجھے اپنی شریکِ حیات پر اعتماد اور یقین ہے کہ وہ میرے بچے بھی ایسے ہی سنبھالے گی جس طرح میری والدہ نے ہمیں پالا ہے۔مجھے ایسے ہی کمانڈ کرنی ہے جیسے آپ کو اور مجھے سکھایا گیا ہے۔جان تو کہیں بھی جا سکتی ہے۔۔۔

میجر طارق انیس میجر انیس شہید کے اکلوتے بیٹے تھے انہیں اور ان کی چھوٹی بہن کو ان کی والدہ نے انتہائی ہمت اور بہادری سے پالا تھا اور اپنے شہید شوہر کی کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔میجر طارق انیس نے آرمی برن ہال کالج ایبٹ آباد سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاک فوج میں 85 لانگ کورس میں شمولیت اختیار کی۔ پاسنگ آؤٹ کے بعد اپنے شہید والد کی یونٹ 1 ایف ایف میں کمیشن حاصل کیا۔وہ شروع سے ہی ایک نڈر سپاہی تھے۔29 نومبر 2007 کو

ان کو میران شاہ سے بنوں تک آر او ڈی (ROD) لے جانے کا حکم ملا۔اس وقت ملک دشمن عناصر اور دہشت گردوں کی کارروائیاں عروج پر تھیں۔انہوں نے میران شاہ سے عیدک تک چار کے قریب خود ساختہ بموں کو ناکارہ بنایا۔عیدک کے مقام پر انہیں جب شک ہوا کہ اس جگہ پر بھی خود ساختہ بم لگایا جا سکتا ہے تو انہوں نے ایس او پی (SOP) کے مطابق بموں کی تلاش شروع کر دی۔ان کی پارٹی نے ایک بم کو ڈھونڈ نکالا اور اس کو ناکارہ بنانے کا عمل شروع کر دیا۔شعور کا تقاضا یہی تھا کہ وہ بم ڈسپوزل پارٹی سے تھوڑے دور رہتے مگر آپ دو کمپنیوں کے ساتھ دو بٹالینز پر حملہ کرنے والے انیس شہید کے بیٹے تھے۔اپنے جوانوں سے دور ہونا گوارہ نہیں کیا۔اسی اثنا میں ایک دہشت گرد نے قریب میں لگائے گئے ایک اور آئی ای ڈی کو ریموٹ کنٹرول سے اڑا دیا۔ نتیجے میں میجر طارق انیس شدید زخمی ہوئے۔ان کے ساتھ موجود نائب صوبیدار طاہر سلطان، حوالدار محمد علی، نائیک محمد شفیق، سپاہی اکرام اور لانس دفعدار افضل (4 کیولری) موقع پر ہی شہید ہو گئے۔میجر طارق انیس کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے بنوں منتقل کیا گیا مگر وہ زخموں کی تاب نہ لا سکے اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

سلام ہے اس عورت پر جس نے اپنے جوان شوہر کی موت کا رنج اپنے بچوں تک نہیں پہنچنے دیا۔اس عظیم بیوی اور ماں پر جس نے اپنا شوہر اور اپنا لختِ جگر دونوں اس پاک دھرتی پر قربان کئے۔اور سلام ہے اس گمنام مجاہدہ پر جو اس قوم پر اپنے شوہر کا کیا ہوا احسان جتائے بغیر اپنے دونوں بچوں کی پرورش کر رہی ہے اور بچوں کے اٹھارہ سال سے اوپر ہونے کی وجہ سے پاک فوج کی طرف سے بچوں کو دی جانے والی مالی امداد بھی واپس کر دی ہے کہ اس کا حقدار اب کوئی اور ہے!!!

دہشتگردی سے ایک شہری کی دلیرانہ جنگ

جبار مرزا

پاکستان دہشت گردی کے خلاف اور امن کے حصول کے لئے 2001ء سے 2018ء تک تقریباً 80 ہزار سے بھی زائد قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکا ہے۔ خارجی اور داخلی محاذ پر افواجِ پاکستان اور شہریوں کی شجاعت کی لازوال داستانیں ہیں۔ اس سانحاتی کہانی اور روح فرسا روداد کا خوش آئندہ پہلو یہ ہے کہ ہر حادثے اور دہشت گردی کے واقعے سے قوم میں جینے کا ولولہ اور جذبہ اور بھی زیادہ نکھر کے سامنے آیا، اس سلسلے میں بہت سی مثالیں موجود ہیں جو نئی نسل کے لئے دلیری سے زندگی گزارنے اور بے چہرہ دشمن کے مذموم عزائم کو خاک میں ملانے کے لئے دی جاسکتی ہیں۔ مگر اسلام آباد ضلع کچہری کا واقعہ عجیب کہانیاں چھوڑ گیا ہے۔ سیکٹر ایف۔ 8 مرکز کی سول کورٹس جہاں 3 مارچ 2014ء بروز سوموار سوا آٹھ بجے صبح جب عدالتیں لگ چکی تھیں، اہلکار سائلین کو پکار رہے تھے۔ ہفتے کا آغاز تھا، پہلا دن، عوام کا جمِ غفیر، بھرپور چہل پہل۔ اچانک ماحول میں سراسیمگی پھیل گئی۔ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور دستی بموں کے دھماکوں سے خوفناک تر ہوگئی۔ قانون کے محافظوں کے اجلے لباس سرخ ہو گئے۔ انصاف کی سربلندی کے منصفوں کے جسم بے جان اور ماحول لہولہان ہوگیا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا ہوگیا ہے۔ لوگ جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ کیا بھاگتے رہنے کا نام ہی زندگی ہے؟ رائے اظہر حسین کو اس کا احساس اُس روز کچہری میں دہشت گردوں کی فائرنگ سے خوف زدہ ہو کر بھاگتے لوگوں کو دیکھ کر ہوا، کب تک بھاگتے رہیں گے؟ اگر اسی طرح بھاگتے رہے تو کیا ہم اپنی آنے والی نسلوں کو محفوظ مستقبل دے پائیں گے؟ نہیں!!! نہیں کی اس غیبی آواز نے رائے اظہر حسین کو بھاگنے سے روک دیا، مقابلے

میں دہشت گرد کے پاس کلاشنکوف تھی مگر ہمت، غیرت اور حوصلہ جو رائے اظہر کے پاس تھا، دہشت گرد اُس سے محروم تھا، وہ کمزور تھا، بزدل بھی تھا اگر دلیر ہوتا تو نہتے شہریوں پر کلاشنکوف لے کر نہ چڑھ دوڑتا۔ رائے اظہر نے پتھر اٹھالیا اُسے اپنے رب کا وہ فرمان یاد آگیا کہ دشمن کے مقابلے میں اپنے گھوڑے تیار رکھو، دنیا کا پہلا اسلحہ پتھر!! ایک لمحے کے لئے دہشت گرد بھی دہشت زدہ ہوا کہ یہ کون سرفروش ہے جو کلاشنکوف کے سامنے پتھر لئے کھڑا ہے، وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا ایک ایک لمحہ تاریخ بنتا جارہا تھا وقتِ فیصلہ ہی سے قوموں کا مستقبل بنتا بگڑتا ہے۔

رائے اظہر اقبال کا شاہین بن چکا تھا اُس کے قانون ساز ذہن پر وہ مصرع دستک دینے لگ گیا کہ

؎ لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اس نے اپنی پوری ایمانی قوت سے وہ پتھر دہشت گرد کو دے مارا۔ پتھر نشانے پر لگا، دہشت گرد نشانے پر آیا، مگر وائے افسوس کہ پتھر نے دہشت گرد کے جسم پر نشان تو چھوڑا، زخمی تو کیا مگر اس کے مکروہ عمل کو ختم نہ کرسکا۔ ایک نہتے شہری کے اس جرأت مندانہ وار نے دہشت گرد کو ایک عجیب غصے کی کیفیت میں مبتلا کردیا۔ دہشت گرد پلٹا، ٹریگر سے اس کی انگلی اٹھ چکی تھی۔ وہ رائے اظہر کی طرف لپکا، وہیں پر اِدھر اُدھر بھاگتے چند لوگ ایک کمرے میں پناہ کی تلاش میں چھپتے پھر رہے تھے۔ دہشت گرد کی خوفناک نگاہیں جب اُس کمرے کی طرف اٹھیں تو رائے اظہر نے غزال کی سی چوکڑی بھری اور کمرے کے دروازے کو اندر سے اپنے جسم کے زور پر بند کردیا۔ دروازے کی اندر والی کنڈی نہیں تھی اگر ہوتی بھی تو وہ وقت کنڈی لگانے والا نہیں تھا۔ کند ذہنوں کی کنڈیاں کھولنے کا وقت تھا۔ دہشت گرد نے دروازے کو دھکے دیئے، لاتیں ماریں، خرافات بکیں، دروازہ توڑنے کے جب سارے حربے آزما چکا تو اُس نے رائے اظہر کو مخاطب کرکے کہا تم کلمہ پڑھ لو یقیناً وہ اُس وقت کلاشنکوف کے ٹریگر پر انگلی رکھ چکا تھا ایسے لمحے رائے اظہر اور دہشت گرد کے درمیان کچھ اس قسم کا چالیس سیکنڈ کا مکالمہ ہوا تم کلمہ پڑھو رائے اظہر نے جواب دیا تم کون

ہو جو کلمہ پڑھا کے مارتے ہو؟ اُس نے کہا تم اور تمہارا پیشہ کافر ہے، اسلام میں اس کی جگہ نہیں رائے اظہر نے جواباً کہا اسلام اور پاکستان تم ظالموں کا نہیں بلکہ کروڑوں پُر امن پاکستانیوں کا ہے۔ اس پر تلملا کر دہشت گرد نے کلاشنکوف کا فائر کھول دیا۔ سات گولیاں انتہائی قریب سے رائے اظہر حسین کے جسم میں اتر گئیں۔ پھیپھڑے اور جگر کا بایاں حصہ چھلنی، ٹانگ، چہرہ زخمی۔۔۔ لہولہان اظہر محض گوشت پوست کا ہوتا تو ڈھیر ہو چکا ہوتا، وہ شجاعت کا پہاڑ بن چکا تھا۔ وہ اگر زمین پر گرا بھی تو جسم کو دروازے سے الگ نہ ہونے دیا۔ دہشت گرد کسی طور پر دروازہ کھول نہ سکا۔ باہر مسلسل گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور چیخ و پکار، آتی رہی۔ قریب قریب چالیس منٹ بعد پولیس نے میگا فون پر اعلانات شروع کئے، حالات پر قابو پانے کی خوشخبریاں سنائیں۔ جو جہاں چھپا بیٹھا ہے، امان میں ہے، باہر آجائیں۔ ایسے میں اظہر حسین کو جو بے ہوش ہو چکا تھا، کمرے میں موجود تین وکیل ساتھی کمرے سے اٹھا کر باہر لائے۔ آج جب ہم رائے اظہر حسین کے سینے پر صدر پاکستان کا دیا ہوا تمغۂ شجاعت دیکھتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ

؎ حق بہ حق دار رسید

3 مارچ 2014ء کے اس واقعے میں بلکہ دلخراش سانحے میں ایڈیشنل سیشن جج رفاقت احمد اعوان، 4 وکیلوں سمیت جن میں راؤ عبدالرشید، میاں محمد اسلم، تنویر احمد شاہ اور خاتون وکیل فضاء ملک شامل ہیں۔ گیارہ انسانی جانوں نے شہادت پائی جن میں ایک پولیس کانسٹیبل بھی شامل تھا۔ زخمیوں کی تعداد 29 تھی۔ دہشت گردوں کی تعداد 6 تھی۔ ایک دوسری اطلاع کے مطابق وہ آٹھ تھے اور جدید اسلحے اور دستی بموں سے لیس تھے۔ اس دہشت گردی کی ذمہ داری ایک نئے گروہ احرارالہند نے قبول کی تھی۔ جب کہ تحریک طالبان نے لاتعلقی کا اظہار کیا تھا البتہ انہوں نے اس واقعہ کی مذمت بھی نہیں کی تھی۔

رائے اظہر حسین میرے سیکٹر میں بلکہ گھر کے قریب ہی قیام پذیر ہیں بعض اوقات مسجد یا مارکیٹ میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ ایک بار میں نے پوچھا کہ جب سارے اِدھر اُدھر بھاگ رہے

تھے ہر کسی کو اپنی پڑی ہوئی تھی تو ایسے میں آپ نے کلاشنکوف بردار کو پتھر مار کر اپنی طرف متوجہ کیوں کیا، بھاگ کر جان کیوں نہ بچائی؟ اس پر رائے اظہر نے کہا کہ زندگی اور موت کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ میں نے ایک پتھر سے درجن بھر جانیں بچائیں۔ وہ کیسے؟ وہ دہشت گرد سامنے والے تین چیمبرز پر کلاشنکوف تانے کھڑا تھا اور میرے وکلاء ساتھی جو اندر سے کنڈیاں لگائے کھڑے تھے وہ اس کے رحم و کرم پر تھے۔ میں نے کہا یہ ایسا کون آ گیا ہے جو بآواز بلند کہہ رہا ہے کہ کلمہ پڑھو میں فائر کرنے لگا ہوں، ایسے میں، میں نے اُس کی پیٹھ پر پوری قوت سے پتھر مارا تو ٹریگر سے اس کی انگلی ہٹ گئی وہ میری طرف پلٹا تو میں قریب ہی اظہر رشید کے چیمبر میں چلا گیا جہاں چند دیگر وکیل بھی پناہ لے چکے تھے۔ اگر اللہ پاک مجھے ہمت نہ دیتے، میں وہ ایک پتھر نہ مارتا تو وہ سارے ساتھی شہید کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

رائے اظہر حسین کا تعلق جھنگ سے ہے۔ وہ 20 اپریل 1968ء کو سیٹلائٹ ٹاؤن جھنگ میں منظور حسین رائے کے ہاں پیدا ہوئے۔ میٹرک 1984ء میں اسلامیہ ہائی سکول جھنگ صدر سے، ایف ایس سی پری میڈیکل اور پھر بی اے پنجاب یونیورسٹی سے جب کہ ایل ایل بی لاہور کے قائداعظم لاء کالج سے 1992ء میں کیا۔ وکالت کی ابتداء 1996ء میں تحصیل گوجرہ سے کی۔ پھر لاہور ڈسٹرکٹ کورٹس میں کچھ عرصہ گزار کر 1997ء میں اسلام آباد کی کچہری میں آ گئے اور پھر 2000ء سے ہائی کورٹ اسلام آباد میں بھی سائلین کی وکالت کر رہے ہیں۔ ان کی بیگم سحر مشیت جو اسلام آباد میں پاکستان نیوی کے بحریہ کالج کے گونگے بہرے بچوں کو پڑھاتی ہیں، وہ فیصل آباد کے معروف ماہرِ تعلیم، بصارت اور ہاتھوں سے محروم سوشل ورکر کیپٹن مشیت الرحمٰن مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ انسانی بھلائی کا جذبہ ان دونوں خاندانوں کی شناخت ہے۔ جس روز اسلام آباد کچہری میں دہشت گردی کا واقعہ ہوا اس روز رائے اظہر کی بیگم اور بچے فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ وہ تو نو دس بجے والی بس سے جانا چاہتے تھے مگر رائے اظہر انہیں صبح سات بجے والی بس پر بٹھا آئے کہ آٹھ بجے اُن کا کچہری پہنچنا بہت ضروری ہے، یوں وہ کچہری پہنچے، جس عدالت میں پیشی تھی وہاں گئے تو پتہ چلا جج صاحب

چھٹی پر ہیں۔ واپس اپنے چیمبر کی طرف آرہے تھے کہ راستے میں دہشت گرد سے پنجہ آزمائی ہوگئی۔

اسلام آباد کی ضلعی اور پمز ہسپتال انتظامیہ دونوں نے رائے اظہر کا بچ جانا ایک زندہ معجزہ قرار دیا تھا جس کا اعتراف 23 مارچ 2016ء کو ایوان صدر میں تمغۂ شجاعت دینے سے پہلے پڑھے گئے سپاسنامے میں بھی کیا گیا تھا۔ رائے اظہر حسین دراصل 3 مارچ 2014ء کی شام تک شہادت پانے والوں میں شمار ہوتے رہے۔ اسی لئے مختلف ٹی وی چینلز پر ٹکر چلتے رہے، شہید ہونے والوں کے نام بھی بتائے جاتے رہے۔ رائے اظہر کے دوست انہیں مردہ خانے میں ڈھونڈتے رہے۔ بہن مرنے والوں کی فہرست میں ڈھونڈتی رہی، جھنگ اُن کے آبائی گھر میں 4 مارچ بعد از نمازِ عصر نماز جنازہ کا اہتمام کر دیا گیا۔ ادھر اسلام آباد میں ہمارے سیکٹر کی مسجد ابوالقاسم میں بڑے دکھ اور رنج کے ساتھ اعلان کرتے ہوئے کہا گیا کہ ہمارے ایک بہادر ساتھی رائے اظہر کچہری میں ملک دشمن عناصر سے دست بدست لڑائی میں شہید ہوگئے ہیں بعد از نماز عشاء کرکٹ گراؤنڈ میں نماز جنازہ ادا کی جائے گی لیکن جھنگ سے رائے اظہر کی والدہ مسلسل کہے جا رہی تھیں کہ 'تلاش کرو میرا دل نہیں مانتا کہ اظہر شہید ہوا ہو، وہ زندہ ہے، تسلی سے ڈھونڈو، ہوش مندی اور صبر سے دیکھو۔ اس روز اسلام آباد کے پمز ہسپتال میں ہیڈ سرجن ڈاکٹر رخشندہ تھیں۔ 29 زخمی تو مختلف کمروں اور وارڈز میں تھے مگر شہید ہونے والے بارہ افراد پوسٹ مارٹم کے لئے ایک جگہ اکٹھے پڑے تھے لیکن جب انہیں پوسٹ مارٹم کے لئے لے جانے لگے تو ڈاکٹر رخشندہ نے دیکھا کہ رائے اظہر سانس لے رہے تھے۔ فوری طور پر انہیں آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ پھیپھڑے چونکہ پوری طرح کام نہیں کر رہے تھے، اس لئے وینٹیلیٹر پر ڈال دیئے گئے۔ ایک مہینے سے بھی زیادہ وہ بے ہوشی کی حالت میں رہے۔ اس عرصے میں پمز اور سی ایم ایچ کے ڈاکٹرز کا ایک بورڈ بنا دیا گیا۔ سی ایم ایچ شفٹ کرنا چاہا تو ایئر ایمبولینس نہیں تھی سڑک کے راستے جان کا خطرہ تھا۔ پشاور میں جو ایئر ایمبولینس تھی اُس نے دو لاکھ روپے کرایہ طلب کیا گھر والوں کے پاس جو جمع پونجی تھی تین چار دنوں

میں ختم ہو چکی تھی۔ پمز سے اسلام آباد کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں لے جانا چاہا تو اُن لوگوں نے ڈیڑھ کروڑ روپے ایڈوانس مانگے، صورتِ حال عجیب ہوتی جارہی تھی۔ اسلام آباد بار کے وکلاء ہڑتال پر تھے۔ بار کے صدر نصیر کیانی نے چیف جسٹس صاحب کو وکلاء کے جذبات اور حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا تو انہوں نے چیف کمشنر سے کہا کہ برطانیہ لے جاؤ یا امریکہ رائے اظہر کی زندگی چاہیئے۔ پمز انتظامیہ نے یقین دہانی کرائی کہ علاج میں کوئی کوتاہی نہیں برتی جائے گی اور ہم کوشش ہی کر سکتے ہیں، زندگی دینا ڈاکٹر کا کام نہیں، اللہ کا کام ہے، ڈاکٹرز زندگی بچانے کی تگ و دو کرتے ہیں، سو ہم کریں گے۔ خیر جب مہینے سوا مہینے بعد رائے اظہر کو ہوش آیا تو ڈاکٹرز کے بورڈ نے کہا کہ رائے اظہر بول نہیں سکے گا۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ یادداشت ختم ہو جائے گی۔ لیکن جب مزید کچھ دنوں بعد رائے اظہر نے بولنا اور پہچاننا شروع کر دیا تو ڈاکٹر رخشندہ نے رائے اظہر سے کہا کہ رائے صاحب نئی زندگی مبارک ہو، ہم اتنی ہی کوشش کر سکتے تھے، اب اس بیڈ سے اٹھنا اور چلنا آپ کا کام ہے اگر آپ ہمت کریں گے تو سارا کچھ ٹھیک ہو جائے گا ورنہ ہماری محنت ضائع چلی جائے گی یہ سنتے ہی رائے اظہر مسکرائے اور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ پھر خود ہی بیڈ سے اترے اور جب پہلا قدم اٹھایا تو اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوئیں۔ پمز انتظامیہ اور ڈاکٹرز کے اس خصوصی بورڈ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی سب نے رائے اظہر کا بچ جانا زندہ معجزہ کہا۔

رائے اظہر حسین شاعر بھی ہیں اُن کا پہلا شعری مجموعہ حرف صلیب 2009ء میں شائع ہوا تھا۔ پتلی تماشا زیرِ طبع ہے اور دہشت گردی کے واقعے پر خود نوشت وتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ بھی زیرِ طبع ہے۔

اسلام آباد بار کی سفارش پر رائے اظہر حسین کو صدارتی ایوارڈ، تمغۂ شجاعت 23 مارچ 2016ء کو اس وقت کے صدر پاکستان ممنون حسین نے دیا تھا۔ تمغہ لینے کے بعد رائے اظہر حسین تقریب میں موجود اس وقت کے افواجِ پاکستان کے سپہ سالار جنرل راحیل شریف سے ملنے گئے جن کے سینے پر بہادری اور شجاعت کے کئی تمغے آویزاں تھے۔ جنرل راحیل شریف نے انتہائی گرم جوشی سے اٹھ کے رائے اظہر کو سلیوٹ کیا اور ان کے جذبے اور شجاعت کی داد دی۔ یقیناً رائے اظہر سے مل کر سپہ سالار

پاک فوج کا ایمان پاکستان اور اس کے شہریوں کی بہادری، استقامت اور حب الوطنی پر مزید پختہ ہو چکا تھا۔ رائے اظہر کو آج بھی جنرل راحیل شریف سے یہ مختصر ملاقات یاد ہے اور وہ اس کا تذکرہ نہایت محبت سے کرتا ہے۔

رائے اظہر جیسے لوگ یقیناً کسی معاشرے کے لئے اثاثہ ہوتے ہیں جو اپنے شہر، اپنے لوگوں اور اپنے ملک کے لئے کھڑا ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

قربانیوں کا سفر

محمد ریحان رشید

7 جون 2019ء کو گلگت بلتستان سے کراچی تک فضا سوگوار تھی۔ یہ عید کا دن تھا اور ایک بار پھر سے پاکستان کے ہر کونے سے تعلق رکھنے والے بہادر فوجی جوانوں نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا اور اِس دھرتی ماں کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گئے۔ قربانیوں کا سفر جاری ہے اور آئے روز قوم کے یہ بیٹے دفاعِ وطن کو یقینی بنانے کے عظیم تر مقصد کے لئے قربان ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ 7 جون 2019 کو بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس میں 35 آزاد کشمیر رجمنٹ کے تین افسروں اور ایک جوان، جن میں کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل راشد کریم بیگ، میجر مُعزّ مقصود بیگ کیپٹن عارف اللہ خان اور لانس حوالدار ظہیر شامل ہیں جو خرقمر، شمالی وزیرستان میں ہونے والے IED کے ایک دھماکے میں شہید ہو گئے۔ یہ شہادتیں پاکستان کے چار مختلف حصوں ہنزہ بلتستان، کراچی سندھ، لکی مروت خیبر پختونخوا اور چکوال پنجاب کی نمائندگی ظاہر کر رہی تھیں اور اس بات کی عکاسی کر رہی تھیں کہ پاکستان کے فرزند چاہے وہ کسی بھی رنگ و نسل یا مذہب و عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں دفاعِ وطن کی خاطر سب مل کر جان کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔

چند سال پہلے بھی 35 آزاد کشمیر رجمنٹ کے بہادر جوانوں نے دلیری و شجاعت کی عظیم الشان تاریخ رقم کی تھی۔ جب بھی اس یونٹ کا نام سامنے آتا ہے تو مہمند ایجنسی کے ولی داد آپریشن (اپریل۔جولائی 2011ء) کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس آپریشن کے پہلے دن ہی (6-7 اپریل 2011) کو 12 جانبازوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور 18 جوان شدید زخمی ہوئے۔ اس علاقے میں دہشت گردوں کی تعداد کا اندازہ اس طرح سے لگایا جا سکتا ہے کہ

صرف ایک دن میں گھنم شاہ۔ بکھمال شاہ روڈ کو فوج کے گزرنے کا راستہ صاف کرنے کے لئے پچپن IEDs کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی دہشت گردوں کی کمین گاہ تک پہنچنے کے تمام راستوں پر کثیر تعداد میں بارودی مواد نصب تھا اور ہر ایک جگہ دشمن گھات لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل راشد کریم بیگ شہید اُس وقت میجر اور میجر مُعزّ مقصود بیگ شہید کیپٹن تھے جنہوں نے انتہائی بہادری اور کمال مہارت سے دہشت گردوں کو جہنم واصل کیا اور آپریشن کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ولی داد آپریشن کی کامیابی کے لئے 35 آزاد کشمیر رجمنٹ کی قربانیوں کا اندازہ ایسے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف آپریشن کے مشرقی حصے تک پہنچنے کے لئے 50 میں سے 36 جوان شدید زخمی ہوئے۔ لیفٹیننٹ (اب میجر) عاطف بشیر کا اس آپریشن میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے آدھے سے زیادہ جسم جھلس گیا لیکن وہ ڈٹے رہے۔ اسی طرح لیفٹیننٹ احمد (اب میجر) نے متعدد گولیوں کا سامنا کیا اور شدید زخمی ہوئے لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ بہادر افسروں اور جوانوں نے زخمی ہونے کے باوجود حوصلے نہیں ہارے اور ''فتح یا شہادت'' کا جذبہ دلوں میں رکھتے ہوئے ہر طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کیا اور دہشت گردوں کا پاک افغان بارڈر سے مکمل صفایا کر کے دم لیا۔ اس آپریشن کو کامیاب بنانے کے لئے چار بڑے حملے کئے گئے جن میں جوانوں کی لاتعداد قربانیوں کے صلے میں فتح نصیب ہوئی۔

اِن کی قربانیوں کے نقوش آج بھی مہمند ایجنسی میں ثبت ہو چکے ہیں۔ اُس وقت بھی کیپٹن خضر محمود ستی اور کیپٹن عابد نوید سمیت 26 جوانوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا اور اس آپریشن کی کامیابی پر اُس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے خود جا کر یونٹ کے تمام افسروں اور جوانوں کو اس بہادری اور شجاعت کے بے مثال مظاہرے پر بہت سراہا۔

آج بھی اِس یونٹ کے 29 افسروں اور جوانوں نے اپنے سینوں پر سنہری پٹی جبکہ 62 سپوتوں نے سرخ پٹی سجائی ہوئی ہے جو اِس بات کا ثبوت ہے کہ ولی داد آپریشن کی سختی اور کٹھن مراحل بھی اِن بہادروں کے حوصلوں کو پست نہیں کر سکے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ

موجودہ فوجی جوانوں کے کندھوں پر بھی ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ ہے کہ وہ اپنی بہادری وشجاعت کی روایات کو فخریہ اور نمایاں انداز میں لے کر آگے چلیں۔ پاکستانی قوم ان فوجی جوانوں کے اس جذبۂ حب الوطنی کو ہمیشہ یاد رکھے گی اور آپ کی قربانیوں کی تہہ دل سے شکر گزار رہے گی۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک فوج کی قربانیوں کی لاتعداد ناقابلِ یقین اور ناقابلِ فراموش داستانیں ہیں جن کا ہر ایک ورق بہادری اور شجاعت کی عمدہ مثالوں سے سنہری حروف میں لکھا ہوا ہے۔ جب بھی کوئی جماعت سرکشی پر اترتی ہے تو قانونِ خداوندی اور قانونِ مملکت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا جاتا ہے، فتنہ فساد برپا کر کے ملکی سلامتی کو درپیش مسائل پیدا کئے جاتے ہیں اور اِن درندوں کی ناپاک حرکتوں سے قوم کی جان و مال، رہن سہن، عزت و وقار، معیشت و کاروبار برباد ہوتے ہیں تو ایسی حالت میں جنگ جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہو جاتی ہے اور پھر ایسی ہی حالت میں اِس دھرتی ماں کے بیٹے اِن گھناؤنی سازشوں اور شر و فساد کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر ابھرتے ہیں اور یہی اِس وقت قوم و ملت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب اِن ظالم بھیڑیوں کے ناپاک خون سے ارضِ مقدس کے سینے کو پاک کر دیا جائے اور مفسدوں کے شر سے اللہ کے مظلوم بندوں کو نجات دلائی جائے، جو شیطان کے پیروکار بن کر اور غیر ملکی عناصر کے آلہ کار کی حیثیت سے اِس پاک دھرتی کے غیور عوام پر اخلاقی، روحانی اور مادی تباہی کی مصیبتیں نازل کرتے ہیں۔ ایسے لوگ انسان نہیں، بلکہ انسانوں کی شکل وصورت میں درندے اور انسانیت کے حقیقی دشمن ہوتے ہیں۔

پاکستان میں یہ جو امن وسلامتی نظر آتی ہے وہ وطن پر مر مٹنے والے انہی شہداء کی جاں نثاری و جانبازی کا فیض ہے جنہوں نے اللہ رب العزت کی خوشنودی، وطن سے محبت اور پاکستانی پرچم کی سربلندی کے لئے اپنے خون سے پاکستان کے سدا بہار چمن کو سیراب کیا۔

ہم احسان مند ہیں اِن فوجی جوانوں کے جو اپنے پیاروں کو پیچھے گھروں میں چھوڑ کر، ہر دم ہر وقت تیار، دہشت گردوں کے ناپاک عزائم خاک میں ملاتے ہوئے اِن کٹھن، دشوار گزار وادیوں

اور برفیلی چوٹیوں میں اپنے دن رات بسر کرتے ہیں۔ دن رات، صبح شام، سردی گرمی یا بہار اور خزاں میں ہمارے یہ بہادر جوان اپنے نرم اور گرم بستروں کو چھوڑ کر وطن سے کیا ہوا وعدہ نبھاتے ہیں جو انہوں نے پاک فوج میں بھرتی ہوتے وقت کیا تھا۔ گزشتہ کئی برسوں سے پاک فوج کا ہر رینک متعدد بار ایسے کئی آپریشن کے علاقوں میں دشمن سے برسرِ پیکار رہا ہے۔

سب سے بڑھ کر ہمیں ناز ہونا چاہئے اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں پر جو اپنے لختِ جگر، اپنے سہاگ اور اپنے سہارے کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے وطن پر قربان ہونے کے لئے بھیجتی ہیں۔ کیا اِن ماؤں کو اپنے بچے یاد نہیں آتے ہوں گے؟ کیا کوئی بھی شخص اپنی سب سے پیاری چیز کی قربانی دے سکتا ہے؟ چاہے جتنا بڑا شیر جوان ہی کیوں نہ ہو لیکن والدین کے لئے تو وہ ایک بچہ ہی ہوتا ہے اور کون چاہتا ہے کہ اُن کے بچوں کو گرم ہوا بھی لگے۔ لیکن عقل دنگ رہ جاتی جب وہ والدین جنہوں نے اپنی اولاد کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا، آج خود اپنے ہاتھوں سے اپنے پیارے بیٹے کو دفنا کر آئے ہیں۔ کیا ہم ایک لمحے کے لئے اُن بیواؤں کا سوچ سکتے ہیں جنہیں اپنا مستقبل شوہر کے بغیر گزارنا ہے۔ بچوں کی پرورش کرنی ہے، اُن کی تعلیم، کھانا پینا، شادی، غمی خوشی سب کچھ اکیلے کاٹنا ہے۔ کیا یہ سب آسان ہے؟

اُن بچوں سے کبھی کسی نے پوچھا ہے جنہوں نے بچپن سے ہی یتیمی میں آنکھ کھولی ہو۔ کیا اُن کو اپنا بابا یاد نہیں آتا ہوگا؟ جو اُن کی ننھی منی فرمائشیں پوری کرتا ہوگا، ناز نخرے اٹھاتا ہوگا، اُن کے ساتھ کھیلتا ہوگا اور انہیں تحفظ کا احساس دلاتا ہوگا۔ اُن یتیموں کی ایک دن کی محرومی کا ازالہ بھی کبھی نہیں ہوسکتا۔ جانے والے کو یاد کر کے کیا رونا؟ جو پیچھے رہ گئے ہیں اُن کا ایک ایک لمحہ دکھ بھرا ہے۔ جدائی کا غم جب کسی کو لگتا ہے تو احساس ہوتا ہے۔

لیکن کمال ہے اِس کامل صبر پر جو شہید کے ورثاء بڑے فخریہ انداز میں شہید سے مناسبت پر کرتے ہیں۔ میں نے خود دیکھا جب ایک بیوہ نے اپنے شوہر کے شہید ہونے پر کہا کہ مجھے فخر ہے کہ آج میں ایک عام عورت سے ایک شہید کی بیوہ بن گئی۔ بوڑھے والدین نے اپنے بیٹے کی

شہادت پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ ایک چھوٹی سی بچی نے ایک انٹرویو میں کہا کہ پہلے میرے بابا صرف میرے ہیرو تھے لیکن آج میرے بابا پوری قوم کے ہیرو ہیں۔ بے شک شہید پوری قوم کے ہیرو ہیں اور ہم نہ صرف ان شہداء کے بلکہ ان کے اہل وعیال کے بھی احسان مند ہیں۔

شہادت وہ عظیم مرتبہ ہے جو ہر انسان کے حصے میں نہیں آتا، اس رتبے کو حاصل کرنے کے لئے وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جو کسی دنیاوی منزل کو پانے کے لئے نہیں کرنا پڑتا۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں بھی شہادت اور شہید کے اس قدر فضائل بیان ہوئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور شک وشبہ کی ادنیٰ گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔ ایک حدیث میں ہے کہ جنت میں جانے کے بعد کوئی دنیا میں لوٹنا اور اس کی اشیاء کو پانا پسند نہیں کرے گا سوائے شہید کے، وہ تمنا کرے گا کہ دنیا کی طرف دس بار لوٹایا جائے پھر مار دیا جائے (اس اکرام کی وجہ سے جو وہ وقت شہادت میں دیکھتا ہے۔)

بے شک شہید کے لئے اللہ تعالیٰ کے دربار میں بیش بہا انعامات ہیں اور قیامت کے روز شہید کے سر پر یاقوت کا تاجِ عزت پہنایا جائے گا اور انبیا، صدیقین اور صالحین کا ساتھ نصیب ہوگا۔ سب سے بڑھ کر شہید کی شفاعت، اس کے گھر کے 70 افراد کے حق میں قبول کی جائے گی۔ یہی جذبہ شہادت ہے جو پاک فوج کے ہر جوان کے دل میں ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت بھی ماند نہیں کر سکتی اور یہی شہداء کے جسدِ خاکی سے ٹپکتا خون ہے جو پاک دھرتی کی خوشحالی کا ضامن ہے۔

’موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر‘

از کیٰ کاظمی

کیپٹن نوید احمد شہید کے حوالے سے ایک تحریر

خدا جہاں اولاد دے کر ماں باپ کو نوازتا ہے وہیں وہ اولاد کے ذریعے والدین کا امتحان بھی لیتا ہے۔ کہتے ہیں جو چیز یا رشتہ آپ کو کمزور کر دے بالآخر وہی آپ کی طاقت بن جاتا ہے۔ اولاد کی آزمائش اس دنیا کا سخت ترین امتحان ہے لیکن اگر وہی اولاد والدین کی سرفرازی کا باعث بنے تو مرتے دم تک والدین کا سر فخر سے بلند رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک جواں مرد اور پاک باز بیٹا پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے 11 کلومیٹر کے فاصلے پر موجود داتہ نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ وزارتِ صحت وسیاحت میں نوکری پیشہ والد نے کبھی ایسا کوئی خواب آنکھوں میں نہ سجایا تھا کہ وہ بچوں میں سے کسی کو بھی عسکری زندگی کا حصہ بنائیں گے مگر کچھ خواب والدین نہیں بلکہ ان کی اولاد لے کر پیدا ہوتی ہے۔

چار بہن بھائیوں میں دوسرا نمبر رکھنے والے نوید احمد بچپن سے نہ صرف والدین بلکہ اپنے اساتذہ کی بھی آنکھوں کا تارہ بنے رہے۔ تعلیمی میدان میں اعلیٰ کارکردگی دکھاتے ہوئے جب 1988 میں بی کام کا امتحان پاس کیا تو ان کے اندر کا چھپا ہوا وہ جانباز فوجی دل کے دریچے سے باہر نکلا جو بچپن میں چھپ چھپ کر کاکول اکیڈمی میں ہونے والی مشقیں دیکھتے ہوئے پیدا ہوا۔ نوید احمد نے سرکاری تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی اور اپنے شوق کی بدولت ہمیشہ اچھی کارکردگی دکھائی۔ پاک فوج جوائن کرنے کا شوق اس قدر تھا کہ دو بار ناکام ہونے کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور بالآخر تیسری مرتبہ کامیاب ہو گئے اور یہ جنون نوید کو پی ایم اے کاکول تک لے آیا اور اس

طرح سے 103 لانگ کورس سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد نوید احمد کی زندگی کا ایک ایسا آغاز ہوا جہاں کا سفر کٹھن ضرور تھا مگر منزل قابلِ فخر تھی۔

نیک اولاد ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے لیکن جب اولاد نیک ہونے کے ساتھ ساتھ فرمانبردار بھی ہو تو ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ نوید کے والد سے گفتگو کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ وہ نوید کی یادوں کا ایک خزانہ سمیٹے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ نوید ایک سچا مسلمان تھا وہ فرقہ واریت سے دُور بھاگتا تھا۔ ہمیشہ کہتا تھا کہ فرقہ بازی سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہم مسلمان ہیں اور ہم پر فرض ہے کہ ہم خدا کے دین کا پرچار کریں نہ کہ فرقہ بازیوں میں پڑ کر دنیا کے لئے تماشا بنیں۔ نوید جب بھی چھٹی پر آتے تو اپنے والد کو اپنے ارادوں سے آگاہ کرتے کہ وہ وطن کے لئے جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ جوش میں اکثر کہتے تھے کہ ابو موجودہ دور کے مسلمانوں کے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ افرادی قوت وافر ہے۔ مادی اور معدنی وسائل کی کوئی کمی نہیں، کمی ہے تو صرف قوتِ ایمانی اور ہمت و استقلال کی، اتفاق کی اور جذبۂ جہاد کی۔ یہ تمام اوصاف ہم میں بھی آ سکتے ہیں اگر ہم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور تفرقہ بازی کو پیچھے چھوڑ کر اپنی خوابیدہ غیرت کو جگا لیں۔

بہن بھائیوں سے ان کا رویہ بے حد دوستانہ تھا۔ نوید کے بھائی شفقت منیر نے بتایا کہ بچپن سے ہی ہم دونوں اکٹھے کھیلتے تھے۔ فٹ بال میں نوید بہترین کھلاڑی تھے۔ 1996 میں ہم نے پنجاب ڈویژن راولپنڈی کی طرف سے میچ کھیلا جس میں نوید نے بطور کھلاڑی حصہ لیا اور ہم وہ میچ جیتے۔ نوید کو پیراگلائیڈنگ کا بھی بہت شوق تھا اور اس نے خان پور ڈیم میں اس کی ٹریننگ بھی لی تھی۔ آرمی چیمپئن شپ اور ایئر فورس چیمپئن شپ میں حصہ لے کر بہت سے میڈل بھی جیتے۔ 4 سالہ سروس میں کئی مرتبہ فٹ بال کے میچز جیتے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اس کے نام پر ہمارے اس علاقے میں ایک اکیڈمی (Capt Naveed Ahmed Shaheed Football Academy) بنالی ہے جہاں بہت سے بچے یہ کھیل سیکھتے ہیں۔ بھائی نے بتایا

کہ نوید مجھ سے ہر بات شیئر کرتا تھا چاہے وہ گھریلو مسائل ہوں یا پیشہ ورانہ۔ ہم دونوں کی شکلیں کافی ملتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میری کہیں لڑائی ہوتی تو بدلے میں وہ لوگ نوید سے لڑنے کے لئے آ جاتے۔ بہن سے شرارتی اور پیار بھرا رشتہ تھا۔ ہمیشہ آنے سے پہلے فون پر بہن سے پسندیدہ کھانے کی فرمائش کرتے تھے۔ نوید کے بھائی نے بتایا کہ اکثر نوید بہن کو پیار میں خان کہہ کر بھی چھیڑتے تھے جس سے ان کے بیچ پیار بھری نوک جھوک جاری رہتی۔ والدہ کے لئے بہت فکرمند رہتا۔ اکثر کہتا تھا کہ میں زندہ رہوں یا نہ رہوں آپ کو کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کہتا تھا کیونکہ اب جب ہم اپنی والدہ کو علاج کے لئے سی ایم ایچ لے کر جاتے ہیں تو وہاں کا سارا سٹاف ان کے آگے پیچھے ہوتا ہے۔ SSG نوید کو شروع میں جوائن کرنے کا بے حد شوق تھا اور اس کی ایس ایس جی کے لئے سلیکشن بھی ہوگئی تھی مگر کچھ میڈیکل پرابلمز کی وجہ سے نوید کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ 15 ناردرن لائٹ انفینٹری میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ کمیشن حاصل کرنے کے بعد جلد ہی نوید کی پوسٹنگ 8 ناردرن لائٹ انفینٹری میں ہوگئی اور آٹھ ماہ بعد آرمی ایوی ایشن میں بطور پائلٹ منتخب ہو کر آرمی ایوی ایشن سکول پہنچ گیا۔ ٹریننگ کے دوران ہیلی کاپٹر سے جمپ لگاتے ہوئے اس کے بازو میں موچ آ گئی لیکن اس نے اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا کافی دن گزرنے کے بعد جب موچ بہتر ہوگئی تو اس نے والد صاحب کو بتایا۔

پائلٹ بننے کے بعد کیپٹن نوید کی پہلی تعیناتی 4 ایوی ایشن سکواڈرن کوئٹہ میں ہوئی۔ نوید کی شادی کے دن جب تمام لوگ اس کے نکاح کی تیاریوں میں مصروف تھے تب نوید جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے میں مصروف تھے کیونکہ ان کو نماز نہ پڑھنے پر بے حد غصہ آتا تھا۔ لہٰذا اپنی شادی پر بھی نوید نے پہلے نماز باجماعت ادا کی پھر اپنا نکاح پڑھوایا۔ نوید ایک بہت خیال رکھنے والے شوہر تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی اہلیہ سے کہتے تھے کہ اگر تم نماز نہیں پڑھو گی تو اس سے بچوں پر بُرا اثر پڑے گا۔ ان باتوں کا یہ اثر ہے کہ آج ان کی بیٹی بھی سر پر دوپٹہ رکھے جائے نماز کی طرف لپکتی نظر آتی ہے۔ اپنے فیصلوں پر انہیں بڑا مان تھا اور وہ اپنی ذمہ داریاں نبھانا خوب جانتے تھے۔ جب

19 جنوری 2008 کو گھر سے روانہ ہوئے تو آنکھوں میں نمی تھی لیکن وہ اس کو اپنی مسکراہٹ کے پیچھے چھپا رہے تھے۔ جانے کے بعد انہوں نے اہلیہ کو فون کیا اور کہا کہ اپنا اور نوال (جو اس وقت چند ماہ کی تھی) کا خیال رکھنا۔ شائد ان کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے پاس وقت کم ہے اس لئے وہ اپنے سے جڑے رشتوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سر اٹھا کر اور خم ٹھونک کر جینے کا ہنر صرف وہ لوگ جانتے ہیں جن کو اسدُ اللّٰہی کے لئے دنیا میں بھیجا جاتا ہے یہ منتخب لوگ ہوتے ہیں اور پھر وہ دن بھی آیا جب وہ اپنا آخری مشن لے کر اڑے۔ 6 فروری 2008 کو ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد کوہاٹ کے لئے محوِ پرواز ہوئے۔ ان کے ہیلی کاپٹر میں میجر جنرل جاوید سلطان، بریگیڈیئر محمد افضل چیمہ، بریگیڈیئر سعید احمد، لیفٹیننٹ کرنل پیر عمر فاروق کیپٹن شہزاد اور کیپٹن محمد ہارون سوار تھے۔ صرف پانچ منٹ کے اندر اندر کنٹرول ٹاور نے ان کی آواز سنی۔ ہیلی کاپٹر کسی فنی خرابی کی وجہ سے قابو سے باہر ہو گیا ایک المناک حادثہ پیش آیا اور نوید اپنے ساتھیوں سمیت جامِ شہادت نوش کر گئے۔ یوں ہر میدان میں انعامات اور اعزازات حاصل کرنے والے نوید شہادت کا اعلیٰ ترین انعام لے کر جہانِ فانی سے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ رخصت ہوئے۔

اولاد کا غم تو کوئی بھی انسان نہیں بانٹ سکتا لیکن جب اولاد والدین کے لئے باعث عزت ہو تو ماں باپ کی آنکھوں میں آنسو کم اور سکون زیادہ نظر آتا ہے۔ یہی سکون اور اطمینان ہمیں نوید کے والد کی آنکھوں میں بھی نظر آیا اور یہ سکون اور اطمینان کیوں نہ ہو پاک فوج نہ صرف اپنے ہر سپاہی کا خیال رکھتی ہے بلکہ ان کے اہلِ خانہ کو بھی ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی لئے نوید کے خاندان والوں سے ملاقات کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ وہ پاک فوج کے جوانوں اور ان کی خدمات سے کس قدر خوش ہیں۔ نوید کے والد کا کہنا ہے کہ شہادت کے بعد جب نوید کا تابوت اسلام آباد ایئر پورٹ پہنچا تو وہاں اس وقت سابق جنرل پرویز مشرف بھی موجود تھے، انہوں نے مجھے بے حد حوصلہ دیا اور بعد ازاں ان کی بیگم نے بھی گھر آ کر تعزیت کی جس ادارے کے افسر اتنے دلیر اور احساس کرنے والے ہوں ان کے جوان کیوں نہ باعثِ فخر ہوں۔ نوید نے مجھے اس دنیا

میں ہی نہیں بلکہ آخرت میں بھی سُرخَرو کر دیا ہے۔شہادت کے بعد پاک فوج کی نوید کے خاندان کی کفالت اور رہنمائی سے ان کے اہل خانہ بے حد مطمئن اور ممنون نظر آتے ہیں۔نوید کے والد نے نم آنکھوں سے بتایا کہ جتنی عزت مجھے ایک شہید کا باپ ہونے پر ملی ہے اس کا کوئی بدل نہیں۔سی ایم ایچ علاج کے لئے جاتا ہوں تو وہاں پر موجود بریگیڈیئر بھی مجھے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ احترام مجھے میرے بیٹے کی شہادت نے دیا ہے۔بقول علامہ اقبال:

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دِیَت، اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے، خوں جن کا حَرم سے بڑھ کر
(ضربِ کلیم)

جان اپنی لٹا کر بھی خوش ہیں

وطن کے لئے جان کا نذرانہ پیش کرنے والے قوم کے بہادر بیٹے کیپٹن جنید شہید کے حوالے سے رابعہ رحمٰن کی تحریر

پُرخطر گھاٹیاں ہوں یا بلند و بالا چوٹیاں، زمانہ امن ہو یا حالت جنگ ہمارے عسکری شاہین ہر حال میں مادرِ وطن کی خدمت پر معمور رہتے ہیں۔ ہمارے بھائی اور بیٹے وہ جوان ہیں جو اس وطن کی ناموس و حرمت کی خاطر سر کٹا تو سکتے ہیں مگر جھکا کبھی نہیں سکتے۔

فرزندانِ پاکستان میں سے ایک لیفٹیننٹ کرنل ارشد حسین شاہ ہیں جن کا تعلق 60th Long Course سے ہے وہ 1979 میں پاس آؤٹ ہوئے اور 16 ایس پی جوائن کی، ملک کے مختلف شہروں میں اپنی عسکری خدمات انجام دیتے ہوئے 1996 سے 1998 تک 16 ایس پی کو کمانڈ کیا، لیفٹیننٹ کرنل ارشد کا تعلق گجرات کے ایک گاؤں رسول پور سیداں سے ہے، فوجی افسر کے لئے بیگم اور بچوں کو ساتھ رکھنا اُس وقت مشکل نظر آتا ہے جب اس کا تبادلہ Non Family Station پر ہو جائے، وگرنہ اپنے گھر والوں کو اپنے ساتھ رکھنا اُس کی اوّلین ترجیح میں شامل ہوتا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل ارشد کو عاصمہ کی صورت میں ایک بہادر اور سمجھدار جیون ساتھی ملیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے 1989 میں جواد کی صورت میں ایک بیٹا عطا کیا، پھر 1991ء میں جنید ایک پھول کی طرح مسز ارشد کی آغوش میں ڈال دیا گیا اور پھر ملیحہ ایک تتلی کی طرح اُڑتی ہوئی ان کی زندگی میں آئی اور ان کے آنگن کی بہار مکمل ہو گئی۔

لیفٹیننٹ کرنل ارشد کے بڑے بیٹے نے ملٹری کالج جہلم جوائن کر لیا اس کے پیچھے جنید بھی

اسی کالج میں چلا گیا۔ دونوں بھائی ہمیشہ سے ایک دوسرے کے آگے پیچھے ایک جیسے کام کرنے اور مقابلے پر نمبر لینے کی کوشش کرتے، دوستی کا یہ عالم تھا کہ دونوں ہی فوج میں چلے گئے، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کندھے سے کندھا ملائے ہنستے، قہقہے لگاتے اپنی بہن ملیحہ کے ساتھ شرارتیں کرتے، ماں باپ کی محبتیں سمیٹتے رہے، کیپٹن جواد پاس آؤٹ ہو کر 29 ایف ایف میں پوسٹ ہوئے اور کیپٹن جنید 16 ایس پی اپنے والد کی یونٹ میں چلے گئے، کیپٹن جنید کے بارے میں والد نے کہا کہ جنید (شہید) کو ہمیں کبھی کچھ کہنا نہیں پڑتا تھا جو ڈانٹ پڑتی یا نصیحت کی جاتی، وہ صرف کیپٹن جواد کو کرتے گو کہ کیپٹن جواد گھر کا بڑا بیٹا ہے مگر اس کی طبیعت اور کیپٹن جنید (شہید) کی طبیعت میں فرق تھا، کیپٹن جنید شہید خاموشی سے اپنی محبت کا اظہار کرتا کئی ایسے کام ہوتے جو وہ خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر کر دیتا جس سے اسے بہت دعائیں بھی ملتیں، وہ محبت میں اظہار کا قائل نہ تھا، کیپٹن جنید (شہید) کی بہن ملیحہ آرٹسٹ بننا چاہتی تھی وہ گھر میں مختلف سکیچ بنا کر اس شوق کو پورا کرتی مگر کیپٹن جنید (شہید) اس کی تعریف نہ کرتا مگر چھپ چھپ کر اس کی پینٹنگز کی تصاویر کھینچ کر لے جاتا، نجانے کیپٹن جنید (شہید) نے اپنے اندر اتنی محبت کہاں چھپا رکھی تھی انسان تو انسان وہ جانوروں اور پھولوں کا بھی بہت شیدائی تھا، خوبصورت موروں کی جوڑی بھی پال رکھی تھی۔

کیپٹن جواد کے فوج میں جانے کے بعد ماں باپ نے سوچا تھا کہ کیپٹن جنید کو انجینئر بنائیں گے مگر بھائی کے نقشِ پا پر قدم بہ قدم چلنے والے کیپٹن جنید نے ہمیشہ فوج میں جانے کی شدید خواہش رکھی اور خاکی وردی سدا اُس کا سہانا خواب رہی۔

لیفٹیننٹ کرنل ارشد کے بچے بچپن سے ہی ماہر تیراک، گھڑسوار اور بہترین کھلاڑی تھے، کیپٹن جنید (شہید) کو خاص طور پر پہاڑوں پہ چڑھنے اور جنگی مشقیں کرنے کا بہت شوق تھا، بچپن میں تینوں بہن بھائی لیزر گن کے ساتھ کمرے میں بلیک آؤٹ کر کے جنگ کرنے کا کھیل کھیلا کرتے تھے، کیپٹن جنید اپنے ارد گرد رہنے والوں کے ہر دکھ درد کا اس طرح خیال رکھتے جیسے ان کا اپنا دکھ ہو کسی راہ گیر کو مشکل میں دیکھتے تو کار سے اتر کے پہلے اُس کی مدد کرتے، کیپٹن جنید نے کبھی اپنے دل

کی بات کسی کو نہیں بتائی تھی، وہ جو عملاً کرتے وہی سب کو نظر آتا، پاس آؤٹ ہونے کے بعد انہوں نے کبھی کسی کو یہ نہ بتایا کہ وہ کس جگہ کس آپریشن میں مصروف ہیں، بس یہی کہتے کہ میں بہت امن کی جگہ پر بیٹھا ہوں، جب وہ گھر چھٹی آتے تو کہتے مجھے بہن ملیحہ کا سونا بالکل اچھا نہیں لگتا، وہ سوئی ہوئی بہن کو جگاتے بھی نہ تھے، بس ٹی وی کی آواز تیز کر دیتے یا ملیحہ کے کمرے کے باہر سے ماں کو اونچی اونچی آوازیں دیتے کہ وہ آوازیں سن کر خود جاگ جائے۔ انتہا نرم مزاج محبت سے مزیّن بھائی جب جُدا ہو جاتا ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے، ملیحہ کہہ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنے والی نمی اس کے دل کا درد بیان کر رہی تھی، ماں کا کہنا تھا کہ کیپٹن جنید میرا بیٹا کم میری سہیلی زیادہ تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل ارشد کہنے لگے کہ جب کیپٹن جنید کی کال آتی تو پھر میری بیگم کمرے میں ایک طرف بیٹھ جاتیں اور تین سے چار گھنٹے تک وہ جنید سے بات کرتیں۔ جنید فون بند ہی نہ کرنے دیتا۔ کہتا کہ میں نے ایئر فون لگا رکھے ہیں ماں آپ بولتی رہیں میں اپنا کام کرتا رہوں گا، بس آپ کی آواز میرے کانوں میں آتی رہے اور اکثر تو ماں سیاست پر، رشتہ داروں پر اور گھر کے معاملات میں باتیں کر کے چپ ہو جاتیں تو وہ آگے سے کوئی جواب بھی نہ دیتا مگر وہ ماں کے چپ ہونے پر اتنا کہتا، بیٹے سے بات کرتے ہوئے مائیں تھکتی تو نہیں ہیں، اور بیگم ارشد اس پر واری صدقے جاتے ہوئے پھر باتیں شروع کر دیتیں، مگر اب وہی فون گھنٹوں خاموش رہتا ہے، نہ کوئی آواز آتی ہے نہ کوئی کہتا ہے ماں بولتی رہو میں سن رہا ہوں۔

کیپٹن جنید کو ہر لمحہ کیمرے میں قید کرنا اور اس کی فلم بنانے کا بہت شوق تھا، اب گھر والے وہی دیکھتے ہوئے اپنے شہزادے کو یاد کرتے ہیں، 2015ء میں لیفٹیننٹ کرنل ارشد نے حج کا پروگرام بنایا اور بڑے بیٹے کیپٹن جواد کا نام دیا مگر کیپٹن جواد کا چائنہ کا کورس آ گیا، اتفاق سے حج کی پالیسی کے مطابق چھوٹا بھائی اس کی جگہ جا سکتا تھا تو کیپٹن جنید کو جسے پہلے والدین نے انکار کر دیا تھا کہ آپ بہن کے پاس رہو گے، کا نام دے دیا اور 2016ء میں کیپٹن جنید والدین کے ساتھ حج

پر چلے گئے، والدین کو حج کرانے کی سعادت بھی حاصل کی اور وہاں پہ جتنے بھی بوڑھے بزرگ تھے، ان کی حج کے دوران اتنی خدمت کی کہ وہ بار بار ان کا ماتھا چومتے تو والد نے پوچھا کہ بیٹا تم کیا کرتے ہو کہ یہ سب تمہیں اتنا پیار کر رہے ہیں تو کیپٹن جنید نے والد کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا بابا یہ صرف اللہ کی مخلوق سے محبت کا کمال ہے واقعی وہ لوگوں کے دل جیتنے کا گُر جانتا تھا مگر نجانے اس نے خانہ کعبہ پہ نظر پڑتے ہی کیا مانگا کہ اللہ نے اس کو شہادت کے لئے چن لیا۔

کیپٹن جواد کی شادی کی تیاری میں کیپٹن جنید نے اس طرح حصہ لیا کہ بھائی کے تمام جوڑے، اپنے کپڑے، کارڈز کے ڈیزائن، ہال اور کھانے کا تمام انتظام حج سے واپسی پر انہوں نے کیا، تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی سلنے کے لئے دیئے جانے والے جوڑے جو کیپٹن جنید (شہید) کے تھے جب والد اور بھائی لینے گئے تو ٹیلر نے کہا کہ جن کے سائز کے بنے ہیں ان کو بھی لائیں تا کہ کمی بیشی ہم یہیں ٹھیک کر دیں مگر لیفٹیننٹ کرنل ارشاد سے جواب نہ دے سکے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تو کیپٹن جواد نے کہا کہ میری شادی کی تیاریاں مکمل کرا کے میرا بھائی اس وطن پہ قربان ہو چکا ہے۔ وہ اب یہ سوٹ لینے کبھی نہیں آئے گا، دکاندار کے ہاتھ میں پکڑی قینچی نیچے گر گئی اور آنسوؤں نے اس کے گلے میں پھندا سا بنا دیا۔

قسمت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں، روتے روتے ہنسا دیتی ہے اور ہنستے ہنستے رلا دیتی ہے۔ 22 فروری کو کیپٹن جنید چھٹی کاٹ کر سوات کی طرف روانہ ہونے لگا۔ ہمیشہ سارے گھر والے انہیں بس پر بٹھانے آتے اور وہ ہمیشہ کہتے کہ جب میں بس میں بیٹھ جاؤں تو آپ چلے جایا کریں مگر اس دن جب وہ بس میں بیٹھ گئے تو دوبارہ اتر کر آئے اور ماں کے گلے بہت دیر تک لگے رہے پھر دوبارہ سب کو خدا حافظ کہہ کر چلے گئے، ان کی ڈیوٹی صوابی میں تھی مگر انہوں نے اپنے بھائی کیپٹن جواد کو بھی یہی بتایا تھا کہ وہ سوات میں ہیں، کیپٹن جنید میں بھرپور منظم طریقے سے کامیاب آپریشن کرنے کی خداداد صلاحیت موجود تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی کامیاب آپریشن کر چکے تھے۔

صوابی میں اطلاع ملی کہ دہشت گردوں نے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ وہ غلام اسحاق خان

انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی پر حملے کا پروگرام بنا رہے تھے جس طرح 16 دسمبر 2014ء میں انہوں نے آرمی پبلک سکول پر حملہ کیا تھا یہ بھی ایک خطرناک منصوبہ بنا رہے تھے جس کی اطلاع ملتے ہی کیپٹن جنید کو اس کے لئے چنا گیا۔کیپٹن جنید کا ایک طریقہ کار تھا کہ وہ جہاں بھی جاتے پہلے خود آگے بڑھ کے جائزہ لیتے، خطرے میں اپنے جوانوں سے آگے چلتے تھے، جہاں آپریشن کرنا تھا وہاں پانچ دہشت گرد مقیم تھے جنہوں نے ایک خاندان کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔اس خاندان کا سربراہ ان کے لئے کھانے کا انتظام کرنے نکلا تو اس نے کیپٹن جنید کو بتایا کہ اس کے گھر والوں کو محفوظ کیا جائے۔ اتنے عرصے میں دوسری طرف سے دہشت گردوں نے فائر کھول دیا کیپٹن جنید اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگتے ہوئے گئے اور جوابی فائر کیا۔اتنے میں وائرلیس کے ذریعے آگے اطلاع دے دی کہ آپریشن شروع ہے، اسی اثنا میں اس معصوم یرغمال خاندان کے افراد بھی دہشت گردوں کے چنگل سے رہائی پا چکے تھے۔ہمارے کو براز بھی پہنچ گئے اور SSG کی ٹیم بھی، اس دوران کیپٹن جنید کے ایک سپاہی کو گردن میں گولی لگی تو کیپٹن جنید نے خود اس کی مرہم پٹی کی لیکن چند ہی لمحوں بعد ایک گولی کیپٹن جنید کو آلگی، وہ آپریشن تو کامیاب رہا مگر کیپٹن جنید اپنے ایک ساتھی کے ساتھ شہادت کا جام نوش فرما گئے۔

ٹی وی پر خبر چل رہی تھی کہ صوابی میں کیپٹن جنید دہشت گردوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اور آپریشن کو کامیاب بناتے ہوئے شہید ہو گئے، ملیحہ کیپٹن جنید شہید کی بہن یہ خبر سُن رہی تھی ماں نے کہا یہ کس جنید کی خبر آرہی ہے تو ملیحہ نے کہا کہ ماں یہ کوئی صوابی میں ہیں، ہمارا بھائی تو سوات میں ہے مگر ماں کا دل ڈوب رہا تھا وہ صوفے پر بیٹھ کر درود پاک پڑھنے لگیں، ملیحہ نے والد کو فون کیا تو وہ بھی فوراً گھر پہنچے ساتھ ہی شہادت کی اطلاع موصول ہو گئی۔

کیپٹن جواد کوئٹہ میں تھے ان کے دوست نے خبر سن کر ان سے پوچھا کہ تمہارا بھائی کس جگہ ہے تو اس نے بھی یہی بتایا کہ سوات میں کیپٹن جواد نے پوچھا کیوں کیا ہوا اور پھر ان کو پتہ چلا کہ ان کا بھائی کیپٹن جنید شہید ہو گیا ہے، انہوں نے کہا کہ میرے منہ سے نکلا الحمدللہ کیونکہ ہمارا ایمان ہے

موت کا وقت مقرر ہے، مارچ 2015ء کو انہیں فوجی اعزاز کے ساتھ دفنایا گیا۔ بعد از شہادت ان کو ستارۂ بسالت سے نوازا گیا۔

کیپٹن جنید شہید نے جو تاریخ بھائی کی شادی کی مقرر کی تھی، سب نے فیصلہ کیا کہ یہ فیصلہ ہمارے عظیم شہید کا تھا، اس لئے اسی تاریخ پر شادی ہوگی۔ بڑی سادگی کے ساتھ شادی انجام پائی۔ سب نے کہا کہ کیپٹن جنید شہید کی خوشبو ہال کے پھولوں کی خوشبو کو مات دے رہی تھی، وہ وہیں کہیں تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل ارشد کہتے ہیں کہ میں آج بھی نماز کے دوران اس کو اپنے ساتھ محسوس کرتا ہوں وہ مجھ سے جدا کب ہوا ہے وہ تو مختصر سی مدت میں بے انتہا پیار دے کر ہمیں معطر کر گیا ہے اور اس کی شہادت سے ہم نہ صرف سُرخرُو ہوئے ہیں بلکہ زمین سے لے کر عرش بریں تک وہ ہمیں معتبر کر گیا ہے۔

پاک فضائیہ کا راشد

خدیجہ محمود

؎ پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

راشد آباد سرزمینِ پاک کا ایک شہر جس کے ایک شہباز کی کہانی آسمانوں پر لکھی گئی اور میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ کہانی پڑھتے ہوئے آپ کی چشمِ نم عقیدت سے جھک جائے گی اور سر فخر سے بلند ہو جائے گا۔

لکھنا میرا شوق بھی ہے اور پہچان بھی لیکن کبھی کبھار کوئی موضوع کسی لکھاری کو اتنی مشکل میں ڈال سکتا ہے، اس کا اندازہ مجھے اس مضمون کو لکھتے ہوئے ہوا۔ بخدا اس کہانی کو کئی بار لکھا، پڑھا، پھر پڑھا اور ہر بار نجانے کیوں یہی سوال ذہن میں اُبھر کر آیا کہ میں حق ادا کر رہی ہوں یا نہیں۔؟

تین ہفتے لگے اس تحریر کو فائنل کرنے میں کیونکہ میں تذبذب کا شکار رہی کہ میں کہاں سے اور کس سے شروع کروں۔کس پہلو کی تفصیل زیادہ بیان کروں۔ ایک عظیم باپ ایئر کموڈور شبیر احمد خان جن کو پاک فضائیہ میں شبیر اینجل (Shabbir Angel) کے نام سے جانا جاتا ہے اور جس کا یہ کہنا ہے کہ ماں اور مٹی کا قرض کبھی بھی نہیں اُتارا جا سکتا۔ یا ان کے عظیم تر بیٹے فلائٹ لیفٹیننٹ راشد احمد خان کے بارے میں کہ جو اس شعر کی جیتی جاگتی مثال بنا۔

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
لہو جو ہے شہید کا، وہ قوم کی زکوٰۃ ہے

جس نے ہزاروں معصوم جانیں بچانے کی خاطر اپنی جان قربان کر کے ہمیشہ کی زندگی پالی۔

آیئے آسمان پر لکھی ہوئی یہ کہانی پڑھتے ہیں:

20 اگست 1971ء مسرور ایئر بیس کراچی، مغرب سے کچھ دیر پہلے کا وقت، راشد منہاس شہید کا جسدِ خاکی لایا جاتا ہے۔ ڈیوٹی افسر شہید کا جسدِ خاکی وصول کرتا ہے اور اس کو سیلوٹ کرتا ہے کچھ دیر بعد نمازِ مغرب میں بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہو کر اپنے رب سے اپنے دل کی خواہش بیان کرتا ہے۔ اللہ مجھے بھی بیٹا عطا کرے۔ میں اس کا نام راشد رکھوں گا۔

یہ ڈیوٹی افسر 1971 کا غازی اور اپنے وقت کا بہترین جنگجو ہوا باز فلائٹ لیفٹیننٹ شبیر احمد خان تھا۔ رب تعالیٰ دعا کو شرف قبولیت بخشتا ہے اور یکم مئی 1972 کو رات دو بجے جب یہ جنگجو ہوا باز فضاؤں میں اپنے مشن پر ہوتا ہے تو اس کو یہ اطلاع ملتی ہے کہ اللہ پاک نے آپ کو بیٹے سے نوازا ہے۔

پاک فضائیہ کا یہ شاہین اپنی پرواز مکمل کر کے زمین پر آتا ہے۔ بیٹے کو گود میں لیتا ہے اور اللہ سے کیا ہوا وعدہ نبھاتے ہوئے اس بچے کا نام راشد رکھتا ہے۔ یہ بچہ شروع سے ہی اپنے ہم عمر بچوں سے تھوڑا مختلف تھا۔ مزاجاً زیادہ سنجیدہ اور قدرتی طور پر ہر کام میں زیادہ سمجھدار۔

پرواز کا شوق نہیں بلکہ جنون تھا۔ جب سکوارڈرن لیڈر شبیر احمد خان ایک کورس کے لئے ترکی گئے تو راشد بھی اپنی والدہ کے ساتھ ان کے ہمراہ تھا۔ 12 سالہ راشد نے بہت کم عرصے میں ترکی زبان پر اتنا عبور حاصل کر لیا کہ پاکستان سے آنے والے مہمانوں کا مترجم بن گیا۔ زبان سے واقفیت کی بنا پر ترکی اور دوسرے ممالک سے آئے ہوئے افسران کے بچوں کے ساتھ دوستی بھی جلدی ہوگئی اور کم عمری میں اپنے دوستوں کے ساتھ ترکی کے مختلف شہر اور تاریخی مقامات گھوم آیا۔

شبیر اینجل کے کورس کے اختتام سے پہلے ہی ترکی سے راشد نے امریکہ کے سفر کا ارادہ باندھ لیا اور اکیلا ہی امریکہ کے لئے روانہ ہوگیا۔ امریکہ میں اس کے چچا نے سکول میں اس کا داخلہ کروا دیا جہاں اس نے اپنی ہائی سکولنگ مکمل کی اور چھٹیوں میں پاکستان آگیا جب چھٹیاں ختم ہوئیں تو اس نے امریکہ واپس جانے سے انکار کر دیا۔ جب والد نے اس سے انکار کی وجہ پوچھی تو اس کا جواب

تھا۔

″ serve and die for this country,I Would rather live″

ایک دن راشد نے اخبار میں پی اے ایف جوائن کرنے کا اشتہار دیکھا اور والدین کو بتائے بغیر اس کے لئے اپلائی کر دیا اور سلیکٹ ہو گیا۔

جس دن رسالپور کے لئے روانگی تھی اس نے اپنے والد کو یہ خبر سنائی۔ اس لڑکے کو ہر شخص کو قدم قدم پر حیران کرنے کی عادت تھی۔ 9 جنوری 1991 کو راشد کی فضائی زندگی کا پہلا باب شروع ہوتا ہے۔ راشد کے کورس میٹ اور قریبی دوست گروپ کیپٹن جواد (اوسی ایئر وار کالج فیصل بیس) سے جب گفتگو ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ راشد انتہائی نفیس اور دھیمے مزاج کا انسان تھا۔ میرے لئے یہ بات بہت حیران کن تھی کہ امریکہ میں رہنے کے باوجود اس میں شرم و حیا اور مشرقیت قابلِ داد تھی اور سب سے بڑی بات وہ شبیر اینجل کا بیٹا تھا تو ان کی تربیت تو پھر ہونی بھی بے مثال تھی۔ وہ پیدائشی ہوا باز تھا۔ اس کی فلائنگ کی ہمارے انسٹرکٹر تک مثالیں دیتے تھے۔ سب سے حیران کن بات یہ کہ ایئر کموڈور شبیر ایک سال تک پی اے ایف اکیڈمی رسالپور کے کمانڈنٹ رہے اور اسی ٹائم پیریڈ میں راشد وہاں کیڈٹ کے طور پر تربیت لے رہا تھا۔ لیکن اس نے کبھی بھولے سے بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ کمانڈنٹ کو سیلوٹ ٹھیک نہ کرنے پر وہ سزا بھی پوری کر رہا ہوتا تھا۔

فلائٹ لیفٹیننٹ راشد کے ایک اور قریبی ساتھی گروپ کیپٹن عاصم (اوسی فلائنگ شورکوٹ) جو ان کی شہادت کے چشم دید گواہ ہیں، وہ یادیں تازہ کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ راشد لاجواب فائٹر پائلٹ تھا، جس کو کہا جائے کہ ہوا بازی اس کی روح میں تھی۔ شاید وہ پیدائشی ہوا باز تھا۔ میں وہ دن نہیں بھول سکتا کہ 13 دسمبر 1997 کی صبح ایک ساتھ ناشتہ کیا۔ بریفنگ لی اور اپنی اپنی پرواز کی تیاری شروع کی۔ میں اپنے جہاز پر کھڑا تھا اس کے ٹیک آف کے 15 منٹ بعد میں نے فلائی کرنا تھا۔ میں تیار ہی تھا کہ اچانک شور مچا کہ فضا میں ہمارے ایک جہاز کو آگ لگ گئی ہے رن

وے پر مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ جہاز کو آگ لگ چکی ہے لیکن پائلٹ eject نہیں کر رہا تھا۔ پتہ چلا کہ ایک آبادی کے اوپر سے گزرتے ہوئے جہاز میں کچھ خرابی کے باعث آگ لگ گئی۔ راشد کو بار بار کہا گیا کہ وہ پیراشوٹ کے ذریعے اپنی جان بچالے لیکن ہر بار راشد کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ "Negative" "It's highly populated" آبادی پر ہے اگر میں اپنی جان بچاؤں تو سینکڑوں جانیں ضائع ہو جائیں گی۔

راشد کسی طرح اس جہاز کو آبادی سے نکالتا ہوا ایئر بیس کی طرف خالی جگہ پر لا چکا تھا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک اور راشد خدا سے کیا ہوا وہ وعدہ کہ اپنے ملک اور اس کے رہنے والوں کی حفاظت کا عہد نبھاتے ہوئے اس ملک پر قربان ہو چکا تھا۔

کیا منظر ہوگا راشد کو جب ساقیٔ کوثر ﷺ نے اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے خاتونِ جنت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہوگا لو دیکھو فاطمہ زہراؑ ایک اور ماں کا لال تمہارے لال کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا اپنی ماں کو تمہارے سامنے سرخرو کر گیا۔ جناب زینبؑ ملکوتی مسکراہٹ سے تمہاری بہنوں کو دیکھتے ہوئی کہہ رہی ہوں گی کہ میرے بھائی کی طرح ایک اور بھائی اپنی بہنوں کا مان بڑھا کر آیا ہے۔ شیرِ خدا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ جنت کے اس شجیع اور جری مہمان کی آمد پر استقبال کے لئے خود بڑھے ہوں گے۔

جب شہید راشد احمد خان کی والدہ سے ملاقات ہوئی اور ان سے راشد کے بارے میں بات چیت ہوئی تو تھوڑی دیر کے لئے میں چشمِ تصور سے اس دَور میں چلی گئی کہ جب شہیدوں کا جسدِ خاکی اس کی ماں کے پاس لایا گیا ہوگا۔ تو ایک ماں کا اپنے اکلوتے لختِ جگر کے ساتھ الوداعی ملاقات کا منظر کیسا ہوگا؟

عظیم ماں تیرے بیٹے کی لاش آئی ہے
قسم خدا کی شہادت کی موت پائی ہے

عظیم ماں تیرا نورِ نظر شہید ہوا
خدا کی راہ میں تیرا پسر شہید ہوا
جو دیکھتا ہے ادب سے وہ سر جھکاتا ہے
تیرے شہید کا شاہی جلوس آتا ہے
تیرے شہید کا شاہی جلوس آتا ہے

میں فالکن کمپلیکس میں فلائٹ لیفٹیننٹ راشد کے ڈرائنگ روم میں دیوار پر لگی ان کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ان کے کاندھے پر لگے ان ستاروں کی چمک اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ اس شہید نے نہ صرف اس وردی پر لگے ستاروں کی لاج رکھی ہے بلکہ پاس آؤٹ ہوتے ہوئے وطن اور اہلِ وطن کے دفاع کا جو حلف لیا تھا، جو وعدہ کیا تھا، اس میں بھی رب تعالیٰ نے اُنہیں سُرخرو کیا۔

میں سوچتی ہوں کہ راشد بھائی کیا اس وقت آپ کے سامنے شبیر اینجل کا باوقار سراپا نہیں آیا ہوگا؟ ماتھے پر ماں کے ممتا بھرے بوسے کا لمس محسوس نہیں ہوا ہوگا؟ بہنوں کی مسکراہٹوں اور کھلکھلاہٹوں نے ایک لمحے کے لئے آپ کا ہاتھ نہیں تھاما ہوگا؟ لیکن سلام ہے شہید تم پر کہ تم نے ایک پل کے لئے بھی اپنی دنیا کو یاد کئے بغیر کتنے شبیروں کے راشد اور کتنے راشدوں کے شبیر بچا لئے وہ شعلے جو ماؤں کی کوکھ اور بہنوں کے سہاگ کی طرف بڑھ رہے تھے تمہارے مقدس لہو کے چھینٹوں نے بجھا دیئے۔

راشد میرے بھائی تم کیسے اس راہ کے مسافر نہ بنتے تمہیں تو شبیر نے راشد منہاس کی ابدی زندگی کی شہادت ملتے ہی سجدے میں اپنے رب سے مانگا تھا جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ''ماں اور مٹی کا قرض کبھی نہیں اُتارا جاسکتا'' اور جب مادرِ وطن کی بات آئی تو جنم دینے والی ماں کو بھول گئے۔ پہلے تو ایک گھر میں رہتے تھے اب تو پورے پاکستان میں رہتے ہو، زمین کے ایک ایک ذرے میں مسکراتے ہوئے، آسمان کے ایک ایک تارے میں چمکتے ہوئے۔دین اسلام کے اس بنیادی عقیدے پر کہ جس نے ایک انسان کی جان بچائی اس نے ساری انسانیت کو بچالیا۔

ہم خود تراشتے ہیں منظر کے راہِ سنگ
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

کہتے ہیں کہ اولاد سے نام چلتا ہے تو ایک غازی باپ کے لئے اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہوگی کہ اس کے اکلوتے بیٹے نے مادرِ وطن کے لئے جامِ شہادت نوش کر کے اس کا اپنا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر کر دیا اور جنگجو ہوا باز شبیر ایجل آج بھی اس مٹی کی محبت کا قرض چکا رہے ہیں۔ انہوں نے فلائٹ لیفٹیننٹ راشد احمد خان شہید کے نام پر ٹنڈو الہ یار کے قریب ایک بے مثال تعلیمی شہر ''راشد آباد'' آباد کر دیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو خاموش زبان میں یہ پیغام دیا:

مت سمجھو ہم نے بھلا دیا
یہ مٹی تم کو پیاری تھی
سمجھو مٹی میں سلا دیا

اس بے مثال تعلیمی شہر میں بے شمار معمارانِ مستقبل کو آنے والے وقت کے لئے تعلیمی اور حب الوطنی کے تقاضوں کے تحت تیار کیا جا رہا ہے۔ راشد تم نے تو جاتے جاتے نہ جانے کتنے چراغ جلا دیئے جو آئندہ ارضِ پاک کے لئے جانے کیا کیا فرائض انجام دیں۔ میں اس وقت اپنے آنسو روک نہ سکی جب شبیر ایجل نے گفتگو کے دوان مجھے بتایا کہ میری بیٹی نے اپنے بیٹے یعنی میرے نواسے کا نام بھی ''راشد'' رکھا ہے اور وہ قد کاٹھ اور عادات میں بالکل اپنے ماموں پر گیا ہے۔ اس نے بھی پی اے ایف میں اپلائی کیا ہے، خدا کرے کہ اس کو بھی اپنے ملک کی خدمت کا موقع ملے۔ (شبیر ایجل آپ کون ہیں؟ اور کہاں سے لائے ہیں یہ دل؟)

اس پوری گفتگو کے دوران بخدا مجھے کہیں نہیں لگا کہ شہید فلائٹ لیفٹیننٹ راشد ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جو کہانی ایک باپ اپنی اداس آنکھوں کے ساتھ سنا رہا ہے وہ داستانِ شجاعت ایک سعادت مند بیٹا اپنی مسکراتی آنکھوں کے ساتھ سُن رہا ہے۔

واقعی شہید کہاں مرتے ہیں وہ ہمارے درمیان ہی تو ہوتے ہیں۔ اپنوں کی خوشی میں خوش

اور دکھ میں ان کے ساتھ ۔ واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے پاک فوج کے ایک نغمے کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے ۔

ہل جاتی ہے ہر دستک پر
ماں کو لگتا ہے میں آیا
کوئی پیارا ہے مجھے آپ سے بھی
میں بابا سے یہ کہہ آیا
گھر بار ہے میرا بھی پیچھے
پر آگے بھی گھر میرا ہے
میں جی لوں گا اندھیروں میں
پر میرے بعد سویرا ہے
اِس گھر کی ساری خوشیوں کو
اِک بار نہ گھبرانے دیں گے
اِک سوچ بری بھی سرحد سے
اس پار نہیں آنے دیں گے
کبھی پرچم میں لپٹے ہیں
کبھی ہم غازی ہوتے ہیں
جو ہو جاتی ہے ماں راضی
تو بیٹے راضی ہوتے ہیں

افواجِ پاکستان زندہ باد ۔ پاکستان پائندہ باد

دوارکا کے جانباز

ارمغان نعیم خان

پاکستان کی سمندری حدود اور ساحلوں کی نگہبان، پاکستان نیوی ہمارے ملک کی وہ آہنی دفاعی قوت ہے جس کی قوت، جذبہء ایمانی اور شوقِ شہادت کے آگے دنیا کی ہر قوت ہیچ ہے۔ پاک بحریہ کے سرمایہء فخر اس کے جنگی بحری جہاز ہیں جن پر ساحلی ہوا کے دوش پر لہراتا پاکستان کا پرچم اور اس کے برابر میں پاکستان نیوی کا پرچم اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ملکی بحری سرحدوں کے دفاع کے لئے پاک نیوی کے جانباز ہمہ دم چوکس و تیار ہیں۔ پاک بحریہ کے چاق و چوبند جوان جب ان پرچموں کو سلامی دیتے ہیں تو ان کے قدموں کی دھمک اور ان کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہی تو وہ لوگ ہیں جو اس ملک کی لاج رکھیں گے۔ پاک بحریہ کا ہر جوان بس ایک ہی پیغام دیتا نظر آتا ہے کہ،

وسعتِ آب گوں کا محافظ میں ہوں
ساحل ہو یا ہو بحر، محافظ میں ہوں
اس پاک سر زمیں کی عظمت کی قسم
مثل مادر ہے میری زمیں، محافظ میں ہوں

6 ستمبر 1965 وہ دن ہے جسے ہم بطور یومِ دفاعِ پاکستان مناتے ہوئے اپنے شہداء اور غازیوں کو یاد کرتے ہیں اور اس عزم کو دہراتے ہیں کہ ہم اپنے وطنِ عزیز کے دفاع کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔ اس کے علاوہ ہم 8 ستمبر کے دن کو خصوصاً نیوی ڈے کے طور پر یاد کرتے ہیں کیونکہ یہ وہ دن ہے جس روز ایک ایسا منفرد معرکہ رونما ہوا جس کا تمام تر سہرا پاکستان نیوی کے دلیر

جانبازوں کے سر جاتا ہے۔ یہ وہ دن تھا جب پاک بحریہ نے بھارت کو دوارکا کے مقام پر نہایت کاری ضرب لگائی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اسے دوارکا آپریشن یا آپریشن سومنات کہا جاتا ہے۔

پاکستان نیوی نے 1965 کی جنگ میں بہادری کی مثال قائم کرتے ہوئے اپنے ملک کی لاج رکھی اور دشمن کو ایسا سبق سکھایا جو اسے ہمیشہ یاد رہے گا۔ دوارکا آپریشن نہایت دلیرانہ بحری حکمتِ عملی پر مبنی تھا۔ پاکستان نیوی کے تمام جنگی بحری جہاز اور آبدوز غازی اس آپریشن میں شریک تھے۔ پاکستانی جانبازوں نے ڈنکے کی چوٹ پر بھارتی سمندری حدود میں ڈیڑھ سو کلو میٹر تک نہ صرف پیش قدمی کی بلکہ دوارکا کے اہم ساحلی مرکز پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اسی بہادری سے واپس کراچی پہنچ گئے۔ اس دوران بھارتی بحریہ کو یہ جرأت نہ ہوسکی کہ وہ پاکستانی بیڑے کو روکنے یا کسی قسم کا جوابی حملہ کرنے کی کوشش کرے۔ ساری کی ساری بھارتی بحریہ بمبئی کے ساحل پر دبک کر بیٹھی رہی اور اپنی تباہی کا تماشا دیکھتی رہی۔

بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو بھارتی فوج کے ساتھ ساتھ بھارتی ایئر فورس بھی خوب سرگرم عمل تھی۔ کراچی جو کہ پاکستان کا اہم ترین شہر ہونے کے ساتھ اہم بندرگاہ بھی تھا، پر بھارتی فضائی حملوں کا خطرہ زیادہ تھا۔ جس تواتر کے ساتھ یہ حملے کئے جارہے تھے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی زمینی ریڈار سٹیشن بھارتی فضائیہ کی بھرپور رہنمائی کر رہا ہے۔ پاکستان نیوی کی انٹیلی جنس کو سر توڑ کوشش کے بعد یہ اطلاع ملی کہ بھارت نے دوارکا کے ساحل پر ریڈار سٹیشن قائم کر رکھا ہے جو بھارتی ہوائی جہازوں کی رہنمائی کا کام کر رہا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی پاک بحریہ کی اعلیٰ قیادت اس بات پر متفق ہوگئی کہ اس ریڈار سٹیشن کو تباہ کیا جانا نہایت ضروری ہے ورنہ بھارتی ایئر فورس کے حملے بند نہیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ دوارکا ریڈار سٹیشن کو تباہ کرنے کی کچھ دیگر وجوہات بھی تھیں، جیسے کہ جارحانہ بحری حکمتِ عملی اپنا کر بھارتی بحریہ کو مجبور کرنا کہ وہ بمبئی کے ساحل سے باہر نکلے تاکہ پاک بحریہ کی آبدوز پی این ایس غازی اسے نشانہ بنا سکے۔ اس کے علاوہ بھارتی ایئر فورس کی کارروائیوں کو غیر مؤثر بنانا بھی مقصود تھا۔

دراصل اپریل 1965ء میں رن آف کچھ کے محاذ پر شکست کھانے کے بعد بھارت کی فوج اپنے زخم چاٹتے ہوئے بڑے معرکے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔اس وجہ سے بھارتی ایئر فورس کی سرگرمیاں رفتہ رفتہ بڑھ چکی تھیں جن کی بھرپور معاونت دوارکا ریڈار سٹیشن سے کی جاتی تھی۔ یہ تمام اطلاعات پاک بحریہ کی انٹیلی جنس کے پاس موجود تھیں۔ پاک بحریہ نے اپنی حکمتِ عملی بروقت ترتیب دے رکھی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی یہ اطلاع ملی کہ 6 ستمبر 1965 کو صبح 3:06 منٹ پر بھارتی فوج نے پاکستان پر حملہ کر کے باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دیا ہے تو پاک بحریہ نے وقت ضائع کئے بغیر طے شدہ حکمتِ عملی پر عمل درآمد کا آغاز کر دیا۔

دوارکا ریڈار سٹیشن کو تباہ کرنے کا کام ایئر فورس کو نہیں سونپا جا سکتا تھا کیونکہ ریڈار سٹیشن فضائی حملے سے بروقت آگاہ ہو جاتا چنانچہ یہ کام پاکستان نیوی کو سونپا گیا۔ یہ ایک نہایت خطرناک آپریشن تھا کیونکہ پاک بحریہ کے بیڑے کو بھارتی سمندری علاقے کے بہت اندر تک جا کر اس مشن کو پورا کرنا تھا۔اس کے علاوہ پاک بحریہ کو مکمل طور پر اپنی مدد آپ کے تحت یہ کام سرانجام دینا تھا۔کسی بھی قسم کی بیرونی امداد بشمول فضائی امداد کا مہیا کرنا بالکل ممکن نہ تھا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس تمام آپریشن کو رازداری کے ساتھ مکمل کیا جائے گا۔ دورانِ آپریشن ہر قسم کے مواصلاتی رابطے کی مکمل ممانعت تھی جس کے باعث آپریشن کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

چونکہ پوری پاک بحریہ حالت جنگ میں ہی تھی۔لہٰذا وقت ضائع کئے بغیر پاک بحریہ کے جنگی بحری جہاز شاہ جہان، بدر، بابر، خیبر، جہانگیر، عالمگیر، ٹیپو سلطان اور آبدوز غازی 7 ستمبر کو اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔اس بحری بیڑے کی قیادت کمانڈر پاکستان فلیٹ کموڈور ایس ایم انور کر رہے تھے۔ان کا مشن تھا رات کی تاریکی میں دوارکا کے ریڈار سٹیشن کو تباہ و برباد کر کے رکھ دینا جو کہ ایک نہایت مشکل مشن تھا۔ پاک بحریہ کے یہ مجاہد بالکل اللہ توکل اپنی جان ہتھیلی پر لئے دشمن ملک کی حدود کے اندر اس پر کاری ضرب لگانے جا رہے تھے۔ دشمن کی بحری اور ہوائی فوج کے علاوہ سمندر میں بارودی سرنگوں کی موجودگی کی بھی مصدقہ اطلاعات تھیں، مگر یہ تمام خطرات راہِ حق کے مجاہدوں کو

اپنے ارادوں سے کہاں ہٹا سکتے تھے۔ جیسے جیسے شام ڈھل رہی تھی۔ اس بحری بیڑے کا ہدف قریب آتا جا رہا تھا۔ جنگی فارمیشن بنائے ہوئے تمام جہاز ساحل سے فاصلہ رکھتے ہوئے اس انداز میں بڑھ رہے تھے کہ کسی بھی قسم کے خطرے سے بروقت نمٹا جا سکے۔ ٹیپو سلطان کو بیڑے سے الگ عقب میں رکھا گیا تھا تا کہ وہ عقب کی جانب سے اُٹھنے والے کسی بھی خطرے سے نمٹ سکے۔ بھاری ایئر فورس کے حملے کا خطرہ ان پر ہر دم لہرا رہا تھا، جس سے نمٹنے کے لئے تمام جہازوں کے طیارہ شکن ہتھیار تیار تھے۔ شام چھ بجے کے قریب جہازوں نے اپنی فارمیشن میں تبدیلیاں کیں اور ٹیپو سلطان بھی آگے بڑھ کر بیڑے میں شامل ہو گیا۔

جب بحرِ ہند پر رات کی سیاہی چھا گئی تو تمام جہازوں پر حکم کے مطابق مکمل تاریکی رکھی گئی۔ مکمل مواصلاتی خاموشی تو پہلے سے جاری تھی۔ اب جہازوں کی راہنمائی صرف اور صرف سمتوں کے ذریعے سے کی جا رہی تھی۔ سمت غلط ہونے کی صورت میں سارا منصوبہ خراب ہو سکتا تھا۔ مگر ایسے موقع پر مشیت ایزدی بھرپور مدد کرتی ہے۔ رات نو بجے کے بعد تمام جہاز اپنی سمتوں کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی پوزیشن بھی تبدیل کرتے رہے۔ رات گیارہ بجے کے قریب اندھیرے میں ایک اور بحری جہاز کی موجودگی محسوس ہوئی۔ زیادہ خیال یہ تھا کہ یہ کوئی مال بردار بحری جہاز ہے، درحقیقت وہ بھارتی بحریہ کا لڑاکا جہاز آئی این ایس تلوار تھا۔ پاک بحریہ کے جہازوں کی موجودگی کے باعث تلوار نے چپ چاپ دبکے رہنے میں ہی عافیت جانی۔ تلوار کا عملہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر انہوں نے پاکستانی جہازوں کا سامنا کرنے کی کوشش کی تو پاکستانی جہاز پل بھر میں اسے غرق کر دیں گے۔ اسی خوف کے مارے تلوار کے عملے نے مقابلہ کرنا تو درکنار، کسی قسم کا ریڈیو پیغام بھیجنے کی بھی کوشش نہیں کی۔

نصف شب گئے وہ مرحلہ آن پہنچا جس کا سب کو انتظار تھا اور جس کے حصول کے لئے اس قدر بڑا خطرہ مول لیا گیا تھا۔ تمام جہاز دوارکا کے ساحل کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ پورا شہر ان کی توپوں کی زد میں تھا۔ دوارکا لائٹ ہاؤس کی روشنی دور سے واضح تھی۔ تمام جہازوں کو یہ ہدایت تھی کہ

ہر جہاز سے پچاس گولے فائر کئے جائیں گے اور ریڈار سٹیشن کو بالخصوص نشانہ بنایا جائے گا۔ تمام جہازوں کی توپیں تیار اور ان کو فائر کرنے والے ہاتھ حکم کے منتظر تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ دشمن کو فوری سبق سکھا دیں۔ بالآخر بارہ بج کر چھبیس منٹ پر فائر کا حکم ملا۔ سات کے سات جہازوں کی توپیں آگ اگلنے لگیں۔ پہلے نو عدد گولے عین ریڈار سٹیشن کے احاطے میں جا کر گرے جن کے باعث ریڈار اسٹیشن مکمل طور پر تباہ اور ڈیوٹی پر موجود دو آفیسر اور تیرہ جوان لقمہ اجل بن گئے۔ اسی دوران دوارکا میں موجود بھارتی بحریہ کا ہوائی اڈہ بھی تباہ ہو گیا اور اس کا رن وے اگلے دو ماہ تک ناقابلِ استعمال رہا۔ نہایت اطمینان سے دوارکا شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر تمام جہازوں نے واپسی کی راہ لی اور پوری رفتار پکڑ لی۔

جب اس کارروائی کی اطلاع نئی دہلی میں بھارتی بحریہ کے ہیڈ کوارٹر میں موصول ہوئی تو وہاں صفِ ماتم بچھ گئی۔ بھارتی حکومت نے بھارتی بحریہ کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ ہیڈ کوارٹر نے دبک جانے والے جہاز تلوار کے عملے کو حکم دیا کہ وہ دوارکا جا کر نقصان کی تفصیل معلوم کرے۔ بھارتی بحری مؤرخ ریئر ایڈمرل گلاب موہن لال ہیرانندی نے اپنی کتاب History of the Indian Navy میں لکھا ہے:

"Next morning she (INS Talwar) was directed to send a team to Dwarka to assess the damage. The team found that Radar of the listening post was completely destroyed by the shells, runway of the Naval Air Station was badly damaged and had to be closed for all flights. The Pakistan Navy's attack damaged a railway engine and destroyed a portion of a railway guest house".

اس واقعے کے باعث بھارت کو نہ صرف پوری دنیا میں خفت کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اس کی افواج کے مورال پر بھی اس کا بہت برا اثر ہوا۔ ریڈار سٹیشن تباہ ہونے سے بھارتی فضائی حملے یکلخت ختم ہو گئے۔ ادھر پاک بحریہ کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے کہ پاکستانی بحری بیڑہ بہادری کے ساتھ ،بلاخوف وخطر سمندر میں موجود رہا مگر بھارتی بحریہ کو اس کے قریب آنے کی جرأت تک نہ ہوئی۔ دوارکا کے غازیوں کا کراچی واپسی پر شایانِ شان استقبال کیا گیا۔ جو تاریخ ان غازیوں نے رقم کی تھی وہ رہتی دنیا تک پاکستان نیوی کا وقار بڑھاتی رہے گی اور اس عظیم واقعے کی یاد دلاتی رہے گی کہ جس میں ان جانبازوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر بھارتی پانیوں کے اندر گھس کر اس کا غرور خاک میں ملا دیا۔

’میں نے سیکھا ہی نہیں رَن میں کبھی پسپا ہونا‘

نائیک محمد نعیم (تمغۂ بسالت) شہید کے حوالے سے محبوب حیدر سحابؔ کی تحریر

میدانِ جنگ اور حربی مشقوں کے دوران پاک فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو اپنی خوبیاں، صلاحیتیں اور شجاعت منوانے کے لئے یکساں مواقع فراہم کئے جاتے ہیں اور اس حقیقت کی گواہی وہ عسکری اعزازات ہیں جو سال میں دو مرتبہ 23 مارچ، یومِ پاکستان اور 14 اگست، یومِ آزادی کے تہواروں پر بلاتفریق افسروں اور جوانوں میں اُن کی خدمات کے اعتراف میں تقسیم کئے جاتے ہیں اس مضمون میں تذکرہ کیا جارہا ہے نائیک محمد نعیم شہید کا، جنہیں بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کرنے پر 23 مارچ یومِ پاکستان کے پُرمسرت موقع پر 2018 میں تمغۂ بسالت سے نوازا گیا۔

محمد نعیم سرزمین پاک کے وہ جانباز سپاہی ہیں جنہیں اُن کے ماں باپ اور تمام عزیز و اقارب چوتھی جماعت ہی سے نائیک کے خطاب سے پُکارا کرتے تھے اور وہ یہ لفظ ’نائیک‘ سُن کر سینہ کشادہ کئے اپنے سر کو فخر سے بلند کر کے مارچ کرتے ہوئے ایسے قدم اٹھاتے جیسے کوئی جنرل بہادری کا بڑا اعزاز حاصل کرنے کے بعد اپنے شہر کو پلٹ رہا ہو اور شہر کے لوگ اُس کے استقبال کے لیے چشم براہ ہوں۔

پاک سرزمین کو اپنے لہو کے تابناک قطروں سے، مشکبار بنانے والے شہید نوجوان محمد نعیم 6 ستمبر 1991 کو گوجر خان کے ایک گاؤں ٹھاکرہ موڑ، میں پیدا ہوئے۔ محمد نعیم اپنے بڑے بھائی محمد وسیم سے عمر میں دو سال چھوٹے تھے جو اس وقت بھی سپاہی کی حیثیت سے پنجاب رجمنٹ میں خدمات انجام دے رہا ہے۔ محمد نعیم کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ کے والدِ محترم امیر حسین

آرمی سروسز کور سے 1992 میں لانس نائیک کے طور پر ریٹائرڈ ہوئے، وہ انتہائی مطمئن اور اللہ تعالیٰ کے شکر گزار تھے کہ اب وہ اپنے بیٹوں کو بھی پال پوس کر پاک آرمی میں بھرتی کرائیں گے اور شہادت کا وہ مقام جس سے وہ محروم رہے ان کے دونوں بیٹوں کو مل جائے گا۔ ''ٹھاکرہ موڑ'' گاؤں کی آبادی تقریباً ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہے جس میں سے اڑھائی سو افراد کا تعلق محمد نعیم کے آرائیں خاندان سے ہے۔ شہید نے پہلی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک کی تعلیم (1997-2005) گورنمنٹ ہائی سکول موہڑہ نوری سے حاصل کی، جو آپ کے گھر سے تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا دونوں بھائی ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گاؤں کے خوبصورت مناظر دیکھتے ہوئے خوشی خوشی صبح سویرے سکول پہنچ جاتے۔ محمد نعیم ذرا کچھ بڑے ہوئے تو پھر سکول آنے جانے کے ساتھ ساتھ شام کے وقت گاؤں کے دیگر بچوں کے ہمراہ والی بال بھی کھیلنا شروع کر دیا۔ آپ نے میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول کالس، تحصیل وضلع چکوال سے کی، جو آپ کے گھر سے تین کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ ماں باپ نے اپنے لاڈلے بچوں کی ناز برداریاں کرتے ہوئے ایک سائیکل کا انتظام کر دیا تا کہ دونوں بچوں کو سکول آنے جانے میں آسانی ہو جائے۔ کبھی محمد وسیم سائیکل چلاتا تو کبھی محمد نعیم سائیکل چلانے کا لطف حاصل کرتے اور دوسرا بھائی کیریئر پر بیٹھ کر سفر کرتا میٹرک کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 2008 میں دونوں بھائیوں نے پاک آرمی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تا کہ ماں باپ کی دلی تمنا پوری ہو سکے اور دونوں کی دلی مراد بھی بر آ سکے۔

محمد نعیم کے ماموں محمد افسر اپنی بہن خدیجہ بیگم سے بہت پیار کرتے اور آپس میں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے۔ اُن کے بیٹے سپاہی اللہ دِتہ نے بتایا کہ آرمی میں بھرتی کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ لہٰذا دونوں بھائیوں نے آرمی ریکروٹمنٹ آفس راولپنڈی میں جا کر بھرتی کے لئے رجسٹریشن کروا دی۔ رجسٹریشن کے بعد تحریری امتحان ہوا۔ دوڑ کے مقابلے ہوئے، میڈیکل ٹیسٹ لیا گیا۔ جب یہ تمام سرگرمیاں مکمل ہو چکیں تو تقریباً تین ماہ بعد ماں باپ کی دعاؤں سے دونوں بھائیوں کی محنت رنگ لائی اور کال لیٹرز موصول ہو گئے۔ گھر والے اِس کامیابی پر بہت خوش تھے۔

عزیز و اقرباء بھی گھر والوں کو مبارک باد دے رہے تھے۔

محمد نعیم نے ٹریننگ کے لئے 18 اگست 2008 کو سندھ رجمنٹل سنٹر حیدر آباد رپورٹ کر دی اور بڑے بھائی محمد وسیم نے ایک دن بعد 19 اگست 2008 کو پنجاب رجمنٹ مردان میں رپورٹ کر دی۔شروع ہی سے والدین کو ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ چھوٹا بیٹا محمد نعیم اپنے بڑے بھائی سے ہر موقع پر سبقت حاصل کرتے ہوئے ایک قدم آگے جا رہا ہے مجموعی طور پر پورا خاندان پاک فوج سے وابستگی پر بہت خوش تھا۔ٹریننگ چھ ماہ تک جاری رہی جس میں آپ کو بتایا گیا کہ کس طرح جی تھری رائفل کے مختلف حصے الگ کئے جاتے ہیں، پھر دوبارہ جوڑ کر رائفل کیسے مکمل کی جاتی ہے اور پھر اُسے دوبارہ فائرنگ کے قابل کیسے بنایا جاتا ہے۔تجربہ کار اساتذہ میں میجر، کیپٹن، صوبیدار، نائب صوبیدار اور حوالدار وغیرہ شامل تھے۔پاک فوج میں طے شدہ نصاب کے مطابق اسباق پڑھائے جاتے ہیں۔زیرِ تربیت جوان بھی بڑی محنت، لگن سے کلاسز اٹینڈ کرتے اور فوج سے متعلق نئی نئی چیزیں سیکھتے۔اب نعیم جان چکے تھے کہ نقشہ کیسے پڑھا جاتا ہے۔کمپاس (Compass) کس طرح استعمال کیا جاتا ہے اور کس طرح سے علاقے میں موجود دشمن کی فوجوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ساتھ ساتھ اب اُنہیں علم تھا کہ دن یا رات میں اور خراب موسم میں کس طرح نیوی گیشن کی جاتی ہے۔شام کے وقت تمام زیرِ تربیت جوانوں کو اپنی اپنی پسند کے کھیل مثلاً والی بال، فٹ بال یا باکسنگ وغیرہ کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔اس طرح سخت محنت مشقت، جو راحت کا احساس بھی لئے ہوئے ہوتی، کے بعد سب جوان مستقبل کے بارے میں سہانے سہانے خواب دیکھتے۔ایسے لگ رہا تھا جیسے وقت کو پَر لگ گئے اور وہ بڑی تیزی سے خوبصورت باغوں اور جزیروں کے اوپر سے اُڑتا ہوا گزر رہا ہو۔خدا کے فضل و کرم سے محمد نعیم کی ٹریننگ اپریل 2009 میں مکمل ہوگئی اور اُنہیں 11 سندھ رجمنٹ کے ساتھ وانا بھیج دیا گیا۔اُس زمانے میں وانا میں امن و امان کے حالات انتہائی مخدوش تھے۔قدم قدم پر سفاک دہشت گردوں سے پاک فوج کا سامنا تھا اور دہشت گردی کا ناسور آہستہ آہستہ پورے ملک میں پھیلتا جا رہا تھا۔فوج کے پاس سوائے اس کے

کوئی آپشن نہ بچا تھا کہ فوی طور پر آپریشن کے ذریعے اس کی روک تھام کی جائے۔لہٰذا آرمی میں ٹاپ لیول پر بڑی باریک بینی اور خفیہ انداز میں اس آپریشن کی منصوبہ بندی کر کے عمل شروع کر دیا گیا۔ان تمام سرگرمیوں میں پوری فوج اس قدر مصروف ہوگئی کہ نعیم کئی ماہ تک گھر والوں سے رابطہ نہ کر سکے جس کی وجہ سے سب اہلِ خانہ سخت پریشان تھے۔ ہر وقت مختلف ٹی وی چینلز، ملک کے مختلف حصوں میں دہشت گردوں کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں کی خبریں دے رہے تھے جس سے وطن کی اکثریت تشویش میں مبتلا تھی۔محمد نعیم کے والدین بھی جائے نماز بچھائے اللہ تعالیٰ سے نعیم کی خیر و عافیت کی دعا مانگتے رہتے مگر گزشتہ کئی ماہ سے کسی بھی قسم کا رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ماں باپ ایک دوسرے سے آنسوؤں کی زبان میں بات کرتے اور جب ضبط کا بندھن ٹوٹنے لگتا تو خود ہی ایک دوسرے کو تسلیاں دے کر پھر خاموش ہو جاتے لہٰذا جب کافی عرصے بعد سپاہی محمد نعیم کا بڑا بھائی محمد وسیم ڈیرہ بگٹی بلوچستان سے چھٹی لے کر گھر آیا تو والدہ صاحبہ اس سے گلے مل کر بے ساختہ رونے لگیں اور کہا کہ تقریباً کئی ماہ کا تکلیف دِہ عرصہ گزر چکا ہے مگر بیٹے نعیم کی کوئی خبر نہیں آ رہی لہٰذا تم فوری طور پر معلوم کرو کہ وہ کہاں ہے اور کن حالات میں ہے۔لہٰذا وسیم اپنے چھوٹے بھائی کا پتہ کرنے کے لئے سیالکوٹ روانہ ہوگیا جو اس وقت 11 سندھ رجمنٹ کا ریئر ہیڈ کوارٹر تھا۔وہاں سرکاری نمبر سے کمپنی کمانڈر سے رابطہ کیا جو ایک میجر صاحب تھے۔انہوں نے بتایا کہ محمد نعیم اس وقت بڑے اہم مشن میں مصروف ہیں اور خیریت سے ہیں میری طرف سے والدین کو سلام پہنچانا اور کہنا کہ پریشان نہ ہوں اُن کی اور ملک کی خیریت کی دعا کریں وہ بہت جلد چھٹی لے کر آپ سے ملنے کے لئے آئیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ پانچ چھ دن بعد محمد نعیم چھٹی لے کر گھر آ گئے۔ اِن کو 20 دن کی چھٹی ملی تھی والدہ نے محمد نعیم کو دیکھتے ہی بے قراری سے بوسے لینے شروع کر دیئے۔صدقہ اُتارا اور رب کا شکر ادا کیا۔نعیم نے ماں کی محبتوں میں بھی دھرتی ماں کو یاد رکھا اور بڑے اعتماد سے کہا ”والدہء گرامی مادرِ وطن پر بے شمار بیٹے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں آپ میرے لئے اور وطن کے لئے دعا کریں ان شاء اللہ ملک کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔“

ماں باپ کو اپنے بیٹے کے منہ سے حب الوطنی کے جملے سن کر نہایت خوشی اور اطمینان ہوا۔

محمد نعیم کو کسی کے منہ سے بھی پاک فوج کے خلاف ایک لفظ سُننا گوارا نہ تھا۔ چھٹی کاٹ کر جب وہ واپس یونٹ پہنچے تو اُنہیں اُس قافلے کا حصہ بنا دیا گیا جس میں تقریباً 70 افراد شامل تھے اور اُنہیں چار گاڑیوں میں سڑک کے ذریعے ڈیرہ اسماعیل خان سے وانا جانا تھا۔ کسی غدارِ وطن نے مخبری کر دی۔ دہشت گرد گھات لگا کر بیٹھ گئے پہلے ایک بارودی سرنگ پھٹی اور پھر چھپے ہوئے دہشت گردوں نے فوجی قافلے کو چاروں طرف سے گھیر کر گولیوں کی اتنی شدید بوچھاڑ کی کہ ہر طرف جوانوں کی لاشیں گر رہی تھیں مگر ایسے خراب حالات میں بھی محمد نعیم نے نہ صرف اپنے ساتھیوں کی جانیں بچائیں بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ وہ دشمنوں پر بھی حملہ آور ہوتے رہے۔ اس حملے میں 16 جوانوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور 25 کے قریب شدید زخمی ہوئے۔

ابھی تک محمد نعیم بحیثیت انفنٹری سولجر کے خدمات دے رہے تھے۔ 2011 کے درمیان 11 سندھ رجمنٹ وانا سے واپس سیالکوٹ آئی اور 2012 کے شروع میں کوئٹہ کے لئے روانہ ہوگئی۔ یونٹ سڑک کے ذریعے کوئٹہ کینٹ پہنچی۔ یہاں رجمنٹ کی ذمہ داریوں میں یہ شامل تھا کہ وہ گیس لائنز، ریلوے لائنز اور سڑکوں کی تنصیبات کی حفاظت کرے۔ یہاں سپاہی محمد نعیم کو بی سی سی یعنی بیسک کمبٹ کورس مکمل کرنے کا موقع ملا۔ اب تک آپ رائفل جی تھری، ایس ایم جی اور ایل ایم جی کی ٹریننگ مکمل کر چکے تھے مگر اب آپ کو ایڈوانس ٹریننگ دی جا رہی تھی اور مزید بہتر ہتھیاروں کی مہارت سکھائی جا رہی تھی جس میں مارٹر، آر پی جی 7، آر آر کی ٹریننگ شامل تھی جس میں دشمن کی پوزیشن کا پتہ لگانا بھی شامل تھا۔ اس بیسک کمبٹ کورس میں محمد نعیم نے بہت محنت کی اور ''اے'' گریڈ حاصل کیا۔ اس اعلیٰ کارکردگی کی بنیاد پر محمد نعیم کو فوری طور پر ''نائیک'' بنا دیا گیا۔ یعنی وہ حسین خواب جسے نعیم بچپنے سے دیکھا کرتے تھے۔ لوگوں کے منہ سے لفظ 'نائیک' سن کر خوش ہو جاتے آج اُنہیں اُس خواب کی عملی تعبیر مل چکی تھی۔ اُنہوں نے فون کر کے گھر والوں کو اپنی ترقی کی اطلاع دی اور شکرانے کے نوافل ادا کئے۔ یونٹ اور محلے میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔

کوئٹہ میں 2012۔2014 کے درمیان نعیم (شہید) نے یونٹ پلاٹون کی ''ایم ٹی'' میں مختلف فوجی گاڑیاں چلانے کی ٹریننگ حاصل کی۔اس طرح آپ 2013 سے لے کر 2015 کے درمیان ایم ٹی میں رہے۔نعیم (شہید) کی 2015 کے شروع میں کوئٹہ کینٹ سے ڈیرہ نواب، بہاولپور کینٹ میں پوسٹنگ ہوگئی وہاں ابھی چھ سات ماہ ہی گزرے تھے کہ 2015 کے تقریباً آخر میں آپ کو حکم ملا کہ آپریشن ایریا میرعلی میں رپورٹ کریں۔وہاں رپورٹ کرنے کے بعد آپ نے کمپنی کمانڈر سے درخواست کی کہ آپ کو دوبارا انفنٹری پلاٹون میں واپس بھیج دیا جائے تاکہ دشمن سے براہِ راست مقابلے کا لطف حاصل کرسکیں۔آپ کے کمپنی کمانڈر نے آپ کے جذبے کو سراہتے ہوئے آپ کی درخواست منظور کرلی۔اس طرح آپ ایک مرتبہ پھر انفنٹری کمپنی کی 'سی' پلاٹون میں پوسٹ کردیئے گئے اور فرنٹ مورچوں پر آکر مختلف معرکوں میں دہشت گردوں سے برسرِ پیکار ہوگئے۔

2017 کے شروع میں بریگیڈ ہیڈکوارٹرز نے ایک ایسا ذہین جوان مانگا جو ڈرائیونگ بھی جانتا ہو اور ساتھ ساتھ انٹیلی جینس ڈیوٹی کرنے کی مہارت بھی رکھتا ہو۔اس موقع پر نعیم (شہید) نے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں اور آپ کی گزشتہ شاندار کارکردگی دیکھتے ہوئے آپ کو منتخب کرلیا گیا۔محمد نعیم کو بھی اب یقین ہو چکا تھا کہ وہ اپنے مقصد کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے اور اُس کی عمر بھر کی دعائیں قبول ہونے والی ہیں۔وہ رتبۂ اعلیٰ جسے وہ اپنے رب سے نماز میں رحمتِ عالم ﷺ کا واسطہ دے کر طلب کیا کرتا تھا۔محمد نعیم کے خدّ و خال اور عادات و اطوار افسران کو بتا رہے تھے یہی جوان ہے جس کی اُنہیں تلاش تھی۔

عزمِ راسخ سے پہاڑوں کو ہلا دیتا ہوں
اور ناممکن کو ممکن میں بنا دیتا ہوں
میں ہوں ناچیز سپاہی پَر ہوں خوددار بہت
ہر اِک کم ظرف کو نظروں سے گرا دیتا ہوں

میں نے سیکھا ہی نہیں رَن میں کبھی پسپا ہونا
جان کی بازی سَر دار لگا دیتا ہوں
کَثرتِ فوج پَہ دشمن نہ کبھی ناز کرے
کئی لشکر میں اکیلا ہی بھگا دیتا ہوں
میں ہوں ناچیز سپاہی پَر ہوں خوددار بہت

لہٰذا محمد نعیم (شہید) بجا طور پر اپنے دیگر ساتھیوں کے سامنے سینہ پھُلا کر اور فخر سے سر بلند کر کے چلا کرتے۔ اُنہیں انٹیلی جینس سیل (Cell) میں خدمات کے لئے منتخب کر لیا گیا جو شمالی وزیرستان میں آپریشن ردّ الفساد کی کارروائیوں میں مصروفِ عمل تھا۔ 5 فروری 2018 کو 15 نارد رن لائٹ انفنٹری رجمنٹ نے ایک کامیاب خفیہ کارروائی کے ذریعے ایک نہایت مطلوب دہشت گرد کو ''وانا'' ایریا سے گرفتار کر لیا۔ مشتبہ شخص کی اہمیت کی چھان بین کے لئے اُسے فوراً انٹیلی جینس حکام کے حوالے کرنا اشد ضروری تھا۔ اس لئے انٹیلی جینس سیل کے ایک دستے کو مشتبہ شخص کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ نائیک محمد نعیم اس دستے کا حصہ تھے۔ اس کارروائی کو حتی الامکان پوشیدہ رکھنے کی خاطر سول گاڑی کو سواری کے طور پر استعمال کیا گیا اور رات کا وقت رکھا گیا تا کہ فوجی گاڑیوں کی نقل و حرکت دہشت گردوں کو متوجہ نہ کر سکے۔ نائیک نعیم کو ڈرائیونگ میں مہارت کی بنا پر گاڑی چلانے کی ذمہ داری سونپی گئی بریگیڈ انٹیلی جینس سیل کے دستے نے کامیابی سے مشتبہ شخص کو 15 نارد رن لائٹ انفنٹری سے وصول کیا اور واپسی کے لئے رات کو تقریباً دس بجے سفر کا آغاز کر دیا۔ یہ ایک سول گاڑی تھی جس میں آرمی کے چھ جوان اسلحے سے لیس تھے ایک نائب صوبیدار، ایک لانس نائیک اور تین سپاہی تھے اور نائیک محمد نعیم اپنی جان خطرے میں ڈال کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ مکار دشمن بھی گھات لگائے ناپاک عزائم لئے تیار بیٹھا تھا کہ اپنے دہشت گرد ساتھی کو ہر قیمت پر رہائی دلوائے گا، ورنہ پورے قافلے کو ختم کر دے گا۔ اس دوران راستے میں بریگیڈ انٹیلی جینس سیل کا دستہ باقاعدہ منصوبہ بندی سے لگائی گئی گھات کا شکار ہو گیا۔ نائیک محمد نعیم نے

اس مشکل صورتِ حال میں نہایت حاضر دماغی سے کام لیا اور ڈرائیونگ میں اپنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت تیزی سے گاڑی کو متاثرہ علاقے سے نکالا۔ آپ اپنے تجربے کی بنا پر اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ گھات کے ساتھ ساتھ آئی ای ڈی کی موجودگی بھی لازمی ہے آپ کی اس بروقت اور جرأت مندانہ اقدام کی بدولت گاڑی آئی ای ڈی کے دھماکے کی زد میں آنے سے بچ گئی۔ اس تمام صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے دہشت گردوں کی جانب سے اندھا دھند فائرنگ کی گئی تاہم نائیک محمد نعیم نے انتہائی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گولیوں کی بوچھاڑ میں گاڑی کو متاثر علاقے سے دور پہنچا دیا۔ اسی اثناء میں بہت سی گولیاں نعیم کے جسم میں پیوست ہوگئیں لیکن آپ نے شدید خطرے میں گھرے ہونے کے باوجود انتہائی جاں فشانی اور دلیری سے اپنے ساتھیوں کو گھات کے مقام سے دور پہنچا دیا۔ اس دوران ہمارے جوانوں کو بھی جوابی فائرنگ کرنے کا موقع ملا اور محمد نعیم کی دلیرانہ کوشش کی بدولت دہشت گرد اپنے ساتھی کو بچانے میں ناکام رہے مگر اس دوران نائیک محمد نعیم زخموں سے بے تحاشا خون بہہ جانے کی وجہ سے جامِ شہادت نوش فرما گئے اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ کو مکمل فوجی اعزاز کے ساتھ ٹھاکرہ گاؤں میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ٹھاکرہ گاؤں میں دفن ہونے والا یہ پاک فوج کا پہلا شہید ہے اس سے پہلے قبرستان کا کوئی نام نہ تھا مگر اب اُسے ''نائیک محمد نعیم شہید قبرستان'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ نو ماہ پہلے ہی آپ کی شادی خالہ کی بیٹی سدرہ شبیر سے ہوئی تھی۔ جواب شہید کی اہلیہ کہلوانے پر فخر محسوس کرتی ہے۔ شہادت کا اعزاز حاصل کرنے میں نائیک محمد نعیم شہید اس مرتبہ اپنے بڑے بھائی سپاہی محمد وسیم سے آگے نکل گیا تھا۔ محمد نعیم کی جب شہادت ہوئی بڑا بھائی سیاچن کے محاذ پر دفاعِ وطن کا مقدس فریضہ سرانجام دے رہا تھا۔ ماں بھی اب اپنے آپ کو شہید کی ماں کہلوانے میں خوشی محسوس کرتی ہے اور والد لانس نائیک محمد امیر (ریٹائرڈ) ہر روز صبح سویرے قبرستان جا کر سب سے پہلے اپنے بیٹے کو فوجی انداز میں سلیوٹ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بچوں کی پہچان ماں باپ سے ہوتی ہے مگر میرا بیٹا شہید نائیک محمد نعیم اپنے باپ کی پہچان ہے اور اس نے چوتھی کلاس سے نائیک کا لقب استعمال

کرنے کی لاج رکھ لی۔

آپ کے میٹرک کے استاد قاضی مشتاق جن کا تعلق گاؤں میانہ مستال تحصیل گوجر خان سے ہے جو موہڑہ سے پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔نعیم جب بھی چھٹی پر گھر آتے اُن سے ملنے کے لئے ضرور جاتے۔جب انہیں نعیم کی شہادت کی اطلاع ملی تو 80 سال کی ضعیفی کے ساتھ 5 کلو میٹر کا طویل فاصلہ خود طے کر کے نائیک محمد نعیم شہید کے گھر اہلِ خانہ سے تعزیت کرنے کے لئے آئے اور کہا کہ یہ میرا وہ قابل اور تابع فرمان شاگرد ہے جس پر میں نے ہمیشہ فخر کیا اور تاحیات کرتا رہوں گا۔ محمد نعیم کی 11 سندھ رجمنٹ کے محمد نقاش سے بڑی گہری دوستی تھی اور مختلف کورسز میں دونوں کے درمیان سخت مقابلہ رہتا۔اس نے بھی فرطِ جذبات سے آنسو بہاتے ہوئے کہا کہ نائیک محمد نعیم شہید، شہادت کے مقابلے میں مجھ سے آگے نکل گیا۔قوم کے سپوت نائیک محمد نعیم شہید کو 23 مارچ 2018 کو شاندار دلیرانہ خدمات کے اعتراف میں تمغۂ بسالت سے نوازا گیا۔جب تک افواجِ پاکستان میں ایسے جری سپاہی موجود ہیں۔دشمن سرزمین پاک پر میلی آنکھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔نعیم شہید ہو کر زندہ و جاوید ہوگیا اور دوسرا بھائی سپاہی محمد وسیم ایسا غازی ہے کہ جب نائیک نعیم شہید، تمغۂ بسالت کی تدفین ہو رہی تھی تو وہ اُس وقت سیاچن کے محاذ پر دشمن کے مقابل اپنے حوصلے اور ولولے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

مہر و مَہ و نجوم یہ افواجِ پاک کے
اِن کے نقوشِ پا سے ہے یہ کہکشاں بنی
غازی چلے تو جھک کر سلامی فلک نے دی
یہ جو ہوئے شہید، زمیں آسماں بنی

معرکۂ چونڈہ کے ایک ہیرو

وثیق شیخ

بریگیڈیئر (ر) نثار احمد خاں سو سال کی عمر میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مردِ آہن بریگیڈیئر نثار احمد خاں (ریٹائرڈ) ستارۂ جرأت، 25 کیولری کے بے مثال ہیرو کمانڈر سو سال کی طویل عمر پا کر اس فانی دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ مردِ آہن کون تھا؟ اور یہ خطاب ان کو کیسے ملا، کس نے دیا، اس کے پیچھے شجاعت و دلیری کی ایک داستان ہے۔ 8 ستمبر 1965 صبح چھ بجے جب بھارتی فوج نے 4 ڈویژن فوج سے پاکستان کی سرزمین پر اپنے ناپاک عزائم لے کر حملہ کیا تو لیفٹیننٹ کرنل نثار احمد خاں نے 25 کیولری کی کمانڈ کرتے ہوئے اس حملے کو نہ صرف روک دیا بلکہ صرف دو سکوارڈن کی مدد سے جوابی حملہ کچھ اس برق رفتاری سے کیا کہ دشمن پسپائی پر مجبور ہو گیا۔ اور آئندہ دو دن تک دشمن اسی دہشت میں مبتلا رہا کہ ان کے مدمقابل ایک آرمڈ رجمنٹ نہیں بلکہ پورا آرمڈ بریگیڈ صف آراء ہے۔

کہنے کو تو یہ ایک محاذ پر ایک دن کی جنگ کا احوال ہے لیکن جنگی تاریخ کے طالب علم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اس ایک معرکے نے آئندہ دنوں میں ہونے والی جنگ پر کیا اثرات چھوڑے۔۔ 9 اور 10 ستمبر کو جب دشمن 25 کیولری کے جوابی حملے کی دہشت سے نبرد آزما تھا۔ پاکستانی افواج نے پھلورہ کے مقام پر اپنی پوزیشن بہت مضبوط کر لی۔۔ جنگ کے اختتام پر بھارت پر یہ راز کھلا کہ 8 ستمبر کو ان کا سامنا پاکستانی آرمڈ ڈویژن سے نہیں ایک آرمڈ رجمنٹ کے صرف دو سکوارڈن سے تھا تو بھارتی سورمے اپنا سر پیٹنے لگے۔ کمانڈر بھارتی ویسٹرن کمانڈ لفٹیننٹ جنرل ہربخش سنگھ اپنی جنگی یادداشت میں برملا اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ بھارتی

فرسٹ آرمڈ ڈویژن کمانڈر میجر جنرل راجندر سنگھ (سپیر و 25) کے اس حملے اور ٹکراؤ سے اتنا گھبرا گئے کہ انہوں نے دو دن اسی خوف میں گزار دیئے کہ ان کے سامنے پاکستان کا پورا آرمڈ ڈویژن صف آرا ہے۔۔اور اس دو دن کے درمیان پاکستان نے چونڈہ کے محاذ پر اپنی پوزیشن اتنی مضبوط کر لی کہ آنے والے دنوں کی 14 روزہ جنگ میں بھارتی اس محاذ پر سر پٹختے رہے لیکن ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکے۔۔

یہ جنگ چونڈہ کی چودہ روزہ جنگ کے ایک چھوٹے سے معرکے کا ذکر ہے۔ 25 کیولری کے بہادر کمانڈر نے اپنے آفیسرز اور جوانوں کے ساتھ مل کر اس محاذ پر ٹینکوں کی وہ جنگ لڑی کہ پوری دنیا میں ہونے والی ٹینکوں کی جنگی تاریخ میں اپنا اور اپنے جوانوں کا نام سنہری حروف سے لکھوالیا۔اپنی یادداشت "Missed Opportunities" کے آخر میں Maj Gen Lachhman Singh لکھتے ہیں کہ اگر بھارتی فوج اور فتح کے درمیان کوئی چیز حائل تھی تو وہ تھی 25 کیولری۔ یہ تو تھا دشمن کی طرف سے اعتراف۔جنگ کے اختتام پر جب جنرل موسیٰ نے چونڈہ کے محاذ پر خود اپنی آنکھوں سے بھارتی سینچورین اور شرمن ٹینکوں کی تباہی کا منظر دیکھا تو ٹینکوں کے اس قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا یہ کام تو فولادی انسان ہی سرانجام دے سکتے ہیں اور اسی لئے 25 کیولری کو Men of Steel کا خطاب دیا گیا۔

بریگیڈیئر نثار احمد خاں 23 مارچ 1919 کو پیدا ہوئے۔ 21 مارچ 1943 کو انڈین فوج میں کمیشن حاصل کیا اور قیام پاکستان کے بعد 27 اگست 1948 کو ری کمیشن ہوئے۔

1962 میں 25 کیولری کی تشکیل کا منصوبہ انہیں دیا گیا۔ یہ ذمہ داری اس جانفشانی اور پیشہ ورانہ مہارت سے پوری کی کہ صرف تین سال کے مختصر عرصے میں اس کیولری رجمنٹ نے دنیا کی جنگی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے اپنا نام سنہری حروف سے لکھوالیا۔۔جب بھی کوئی طالب علم ٹینکوں کی جنگوں کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا تو 25 کیولری اور اس کے بہادر کمانڈر بریگیڈیئر نثار احمد خاں کو

ضرور یاد کرے گا جو صرف دو سکوارڈن کے ساتھ چار بھارتی ڈویژن بشمول ایک آرمڈ ڈویژن کو شکست دینے میں کامیاب رہے۔۔

اللہ ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین

شاہیں کا جہاں اور!

بریگیڈیئر ذیشان فیصل خان

جہازوں کے اِنجنوں کی گھن گرج سے میں بے اختیار اپنے گھر کی بالکنی کی طرف لپکا۔ آوازیں اتنی قریب تھیں کہ معلوم ہوتا تھا جیسے جہاز میرے گھر کے سامنے ہی اُڑ رہے ہوں۔ باہر نکل کر دیکھا تو مجھے PAF کے مختلف طیارے مارگلہ کی پہاڑیوں کے درمیان سے نمودار ہوتے دکھائی دیئے اور پھر یہی طیارے فضا میں گھومتے، تیرتے اور کبھی لپکتے اور جھپٹتے دکھائی دیئے۔

23 مارچ 2020 کو بس اب چند دن ہی رہ گئے تھے اور یہ طیارے ان تیاریوں میں اپنے Manoeuvres کی ریہرسل کر رہے تھے۔ 11 مارچ 2020 کو ان ہی میں شامل F-16 کے پائلٹ ونگ کمانڈر نعمان اکرم ایک مشکل Manoeuvre کرتے ہوئے طیارے کی تکنیکی خرابی کے باعث اچانک حادثے کا شکار ہو کر شہید ہو گئے۔ ان کے پاس دو ہی راستے تھے ایک یہ کہ Eject کر جائیں اور نیچے آبادی تباہی سے دوچار ہو جائے اور دوسرا اپنی جان کی پروا کئے بغیر طیارے کو آبادی سے دُور لے جائیں۔ ونگ کمانڈر نعمان اکرم نے دُوسرا راستہ چُنا۔ جو ایک بہادر اور پروفیشنل آفیسر کا راستہ ہوتا ہے۔ اور اسی دوران دنیا نے ٹی وی سکرین پر اس شاہین کو اپنی اگلی منزل کی اُڑان بھرتے دیکھا، شہادت کی وہ منزل جس کو پانے کا خواہش مند افواج پاکستان کا ہر سپاہی ہوتا ہے۔

شہداء کے حوالے سے لکھتے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن ہر دفعہ ہر شہید کی بہادری کی کہانی اپنے منفرد انداز کی ہوتی ہے۔ شہید نعمان اکرم کے والدِ گرامی بریگیڈیئر اکرم سے میرا رابطہ فون پر ہوا۔ وہ لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔ فون پر مجھے وہ پُر اطمینان آواز سے انتہائی بلند حوصلہ

محسوس ہوئے جبکہ اُن کے بیٹے کو اُن سے جُدا ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے۔

24 جنوری 1979 کو کیپٹن اکرم کے گھر سیالکوٹ میں اِن کے بیٹے نعمان اکرم کی پیدائش ہوئی۔ نعمان کیپٹن اکرم کے گھر کی پہلی خوشی تھی اِس لئے تمام گھر کی توجہ اور محبت اِسی کے حصّے میں آئی اور ساتھ ہی اِس خوبصورت اِضافے نے گھر کی رونقوں کو دوبالا کر دیا۔ کیپٹن اکرم، جو بعد میں بریگیڈیئر بنے، کے ہاں نعمان کے بعد بیٹا سلمان اور بیٹی سارہ پیدا ہوئے اور اس طرح اُن کا خاندان مکمل ہوگیا۔

میری بریگیڈیئر اکرم سے جب وِنگ کمانڈر نعمان کی شہادت کے حوالے سے بات ہوئی تو میں نے ایک انتہائی پُر جوش باپ کا اپنی اولاد کے لئے بیان سُنا۔ مجھے لگا کہ بریگیڈیئر اکرم نعمان کی خوبیوں کے اِظہار میں ایک ناقابل بیان سُرور سے سَرشار ہیں۔ ایک ایک لفظ جو وہ بتاتے وہ نعمان کے لئے اُن کی شفقت اور عقیدت میں گندھا ہوا ہوتا۔ بریگیڈیئر اکرم نے بتایا کہ نعمان بچپن ہی سے ایک Ideal Child تھا۔ والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ اِن کی پہلی اُولاد گھر کی اِن قدروں کو اپنائے جس سے باقی بچّے راہ نمائی حاصل کریں۔ نعمان میں محنت، ذہانت اور اِیمانداری کی خوبیاں شروع سے ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ اِس میں بلا کا تدبّر تھا۔ شہادت کے بعد جب کچھ لوگ تعزیت کے لئے گھر آئے تو اِن میں سے بریگیڈیئر اکرم کے ایک دوست نے بتایا کہ جب نعمان 1987 میں مشکل سے سات، آٹھ سال کا ہوگا تو نوشہرہ میں وہ اور ان کے بچّے اُن کے گھر کے لان میں کرکٹ کھیلتے تھے۔ اس کھیل میں اُنھوں نے محسوس کیا کہ جب کوئی دوسرا بچّہ آؤٹ ہوتا تو وہ بہانے بنا کر دوسری باری لیتا لیکن نعمان کو جب بھی آؤٹ قرار دیا جاتا تو وہ ہنستا مسکراتا چلا جاتا۔

1984ء میں بریگیڈیئر اکرم کی ملک سے باہر تعیناتی ہوئی جس کی وجہ سے انھیں اپنی فیملی کو اپنے آبائی گھر میں ہی چھوڑنا پڑا۔ باہر جانے سے پہلے انھوں نے نعمان کا داخلہ پہلی جماعت میں APS لاہور میں کروا دیا۔ گھر سے سکول کا فاصلہ زیادہ تھا اور نعمان چونکہ چھوٹا تھا اس لئے بریگیڈیئر اکرم گھر کے سامنے نعمان کو بس پر جاتا دیکھتے اور پھر سکوٹر پر بس کے پیچھے پیچھے سکول تک جاتے اور

وہاں نعمان کو بس سے اُتر کر سکول جاتا دیکھتے۔ یہ عمل انھوں نے ایک ہفتے تک کیا تا کہ کسی بھی دُشواری کی صورت میں اِس کا حل نکال سکیں اور نعمان کا بھی اعتماد قائم ہو۔ ایک دن جب نعمان اکیلا ہی سکول سے آرہا تھا تو بس راستے میں خراب ہوگئی۔ ڈرائیور نے کہا کہ تمام بچے اپنا بندوبست کر لیں۔ ایسے میں کئی بچوں کے والدین انہیں وہاں آ کر لے گئے۔ نعمان جو کہ اکیلا تھا، اُس نے چھوٹی سی عمر میں سکول کا بستہ گلے میں لٹکایا اور سات کلو میٹر پیدل سفر کر کے ٹھیک ٹھیک گھر پہنچ گیا۔

بچپن کی دوسری باتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جب بریگیڈیئر اکرم کوئٹہ میں سٹاف کالج میں کورس کر رہے تھے نعمان اُس وقت دوسری جماعت میں تھا۔ اُس عمر میں بھی نعمان کی ذمہ داری کا یہ عالم تھا کہ وہ اسکول سے آ کر سب سے پہلے سکول کا کام کرتا یہاں تک کہ وہ کھانا بھی پڑھائی کے بعد کھاتا۔ اُس کی اِس خوبی کی وجہ سے پڑوسیوں کے بچے اکثر والدین کے زیرِ عتاب ہوتے کہ دیکھو نعمان کیسے ذمہ داری سے پڑھ رہا ہے اور تم کیا کر رہے ہو۔

نعمان جب 7th کلاس میں تھا تو اُس وقت بریگیڈیئر اکرم، بنوں میں اپنی یونٹ 10 میڈیم رَجمنٹ (آرٹلری) کمانڈ کر رہے تھے۔ جیسا کہ دُور دراز علاقوں میں پڑھائی کا مسئلہ رہتا ہے اور بریگیڈیئر اکرم کی بار بار پوسٹنگ کی وجہ سے نعمان اور گھر والوں نے دیکھا کہ پڑھائی کا ہرج ہو رہا ہے، ایسے حالات میں بھی نعمان نے PAF کالج سرگودھا کا امتحان دیا اور پاس ہوگیا۔ نعمان نے 8th کلاس میں PAF کالج جوائن کر لیا۔ ایسے میں جیسا کہ ہوتا ہے والدین سے پہلی دفعہ جب بچّہ دُور ہو تو والدین اور بچے دونوں کو یہ تجربہ مشکل سا لگتا ہے۔ نعمان کی والدہ اس کے جانے پر غمگین تھیں پھر نعمان کا بھی خط آ گیا کہ اِس کا دل نہیں لگ رہا۔ بریگیڈیئر اکرم ابھی اِس پر کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ نعمان کا مہینے کے بعد پھر خط آیا کہ اُس کی فکر نہ کریں اُس کا دل لگ گیا ہے اور وہ پڑھائی سے مطمئن ہے اِس خط کے بعد اس کی والدہ اور گھر والوں کو تسلی ہوئی۔

ایئر فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ نعمان اور گھر والوں دونوں ہی کا تھا۔ جہاں اُس میں ایک بنیادی سوچ بہتر تعلیم کے مواقع تھے وہاں وطن کی خدمت کا جذبہ اُس کا ایک اہم محرک تھا۔

ملک کا دفاع ایک عظیم فریضہ ہے۔ مقصد دفاع کرنا ہے چاہے وہ کسی بھی مورچے سے کیا جائے۔ تمام افواجِ پاکستان وطن عزیز کی حرمت کی امین ہیں اور اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہی ہیں۔

بقول بریگیڈیئر اکرم کے، نعمان کے دوستوں نے انھیں بتایا کہ اکیڈمی کے دنوں میں جب زندگی انتہائی چیلنجنگ ہوتی تھی، نعمان ہمیشہ دوستوں کے کام آتا، کئی موقعوں پر نعمان دوستوں کا کام خود کر دیتا تھا۔ پروفیشنل زندگی میں اس کو جب بھی کبھی کوئی پروجیکٹ ملتا وہ روزانہ اس کا دورہ کرتا اور کام کی نگرانی کرتا۔ اس کے دوست جب اس سے پوچھتے کہ تم نے یہ عادت کہاں سے اپنائی ہے تو وہ یہ کہتا میں نے یہ اپنے ابا سے سیکھی ہے کیونکہ وہ بھی اپنے کاموں کا ایسے ہی معائنہ کرتے تھے۔ بریگیڈیئر اکرم نے بتایا کہ نعمان انھیں Idealize کرتا تھا اور وہ اکثر اس کا اظہار اپنے دوستوں سے کرتا تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ اِس کے والد ایک انتہائی ڈسپلنڈ انسان ہیں اور وہ گھڑی کے مطابق چلتے اور کام کرتے ہیں۔

بریگیڈیئر اکرم نے بتایا کہ پیشہ ورانہ کارکردگی میں نعمان اپنے عروج پر تھا جہاں وہ PAF اکیڈمی سے بہترین درجے پر پاس آؤٹ ہوا وہاں بعد میں کمانڈ اینڈ سٹاف کالج میں بھی نمایاں کارکردگی دکھائی۔ ونگ کمانڈر نعمان نے اپنی محنت اور لگن سے Best Pilot Trophy بھی حاصل کی جسے ایئر فورس میں شیر افگن ٹرافی کہتے ہیں۔ یہ اِن کا اعزاز تھا کہ فلائنگ کے دوران اِن کا کال سائن شیر افگن ون، ہوتا۔ بریگیڈیئر اکرم نے بتایا کے ایئر چیف مارشل مجاہد انور خان جب ونگ کمانڈر نعمان کی شہادت کے بعد ان سے ملے تو انھوں نے کہا کہ 9 اسکواڈرن OC ہونا کسی بھی ایئر فورس افسر کے لئے اعزاز ہوتا ہے اور نعمان اس کا صحیح معنوں میں حقدار تھا۔ ونگ کمانڈر نعمان کا یہ بھی ایک اعزاز تھا کہ انھوں نے آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ کو بھی فلائی کروایا اور آرمی چیف نے بریگیڈیئر اکرم سے تعزیت کے وقت نعمان کے ساتھ اِس وقت کو یاد کیا۔ نعمان نے سعودی کراؤن پرنس محمد بن سلمان کے دورے پر اُن کو F-16 میں گوادر سے لے کر اسلام آباد تک Escort کیا۔ ونگ کمانڈر نعمان نے قطر میں ساڑھے تین سال پاکستان کی

طرف سے خدمات سرانجام دیں۔انھیں اپنے اچھے کام اور محنت کی بنا پر قطری حکام نے مزید رہنے کا کہا لیکن نعمان نے وطن عزیز کی خدمات کو اہمیت دیتے ہوئے واپسی کو ترجیح دی۔

ونگ کمانڈر نعمان کی شہادت کے دن بریگیڈیئر اکرم کسی کام سے گاؤں میں تھے۔انھیں گھر سے کال آئی کہ F-16 کے گرنے کی خبر TV پر چل رہی ہے اور اس کے بعد دوستوں کی کالیں آنا شروع ہوگئیں۔بریگیڈیئر اکرم نے حوصلے سے اِس خبر کو سُنا اور گاڑی خود چلا کر گھر پہنچے اور گھر والوں کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔نعمان کی والدہ اور بیگم کے لئے باقی تمام کی طرح یہ خبر ناگہانی تھی اور ماں آخر ماں ہوتی ہے۔یہ ایک مشکل لمحہ تھا جسے تمام لوگ بہادری اور حوصلے سے گزار رہے تھے بریگیڈیئر اکرم کے دوست بھی گھر پر پہنچنا شروع ہو گئے اور کچھ نے کہا کہ تم تو بڑے Humble آدمی ہو اور تمھارے بیٹے نے اتنا بڑا کام کر دیا۔

بریگیڈیئر اکرم کے سامنے نعمان کی پوری زندگی گھوم رہی تھی وہ جو کردار، قابلیت، لگن اور جذبہء ایثار کا پیکر تھا وہ ابدی حیات حاصل کر گیا تھا۔اور بقول والد کے!

"My son was Creator's selection
and he was the chosen one."

اس عظیم اعزاز پر بریگیڈیئر اکرم، اللہ تعالیٰ کے شکر گزار اور اللہ کی رضا پر راضی ہیں۔اب اُن کی زندگی کا محور نعمان کے بچے طلحہ اور عینا ہیں اور وہ ان بچوں میں ہی نعمان کو دیکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا گو ہیں کہ وہ نعمان کی فیملی کی ذمہ داریوں سے بطریق احسن عہدہ برآ ہو سکیں۔

جو قومیں قربانیاں دینا جانتی ہیں تاریخ ہمیشہ ان کو یاد رکھتی ہے جب تک وطن عزیز کے ایسے سپوت موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھیں گے وطن کی حرمت کو کوئی میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا..... یاد رہے کہ پاکستان ہے تو ہم ہیں!

شہادت اُس کی تمنا تھی!

محمد امجد چوہدری

پاک فوج کے کمسن شہید سپاہی محمد عدنان تمغہء بسالت کی داستان جس نے اپنے عزم اور حوصلے سے دہشت گردوں کی کئی مکروہ کارروائیوں کو ناکام بنایا

اس نوجوان کے چہرے پر مَسحور کن وتازگی ہر وقت موجود رہتی۔اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ کوئی اس کی تاب نہ لاسکتا تھا۔اس کا بانک پن اور اس کی جوانی عام نوجوانوں سے ہٹ کر تھی۔اس کے روشن چہرے سے ایک پرکشش مسکراہٹ ہر آنے جانے والوں کو اپنے حصار میں مبتلا کر دیتی۔وہ بالکل میرے پاس والے گھر میں رہتا تھا۔استفسار پر معلوم ہوا کہ وہ اپنے گاؤں سے راولپنڈی شہر پڑھنے کے لئے آیا ہے۔آتے جاتے کبھی کبھار اس سے بات چیت بھی ہو جاتی۔ جس طرح کی صورت،اسی طرح کی سیرت بھی پائی تھی۔بلا کا خوش مزاج اور جس جوش سے دوسروں کی مدد کو بڑھتا،لگتا تھا کہ وہ نیکی میں دیر کرنے کا ہرگز قائل نہیں۔میں نے جب بھی اسے دیکھا دوسروں کا بوجھ بانٹتے ہوئے ہی نظر آیا۔اس کے حُسن اخلاق اور جذبہء خدمت کا ہر کوئی معترف ہوگیا تھا۔

پھر اچانک وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔چونکہ وہ چپکے سے ہر کسی کے دل میں جا بسا تھا،اس لئے اس کی عدم موجودگی کو سب نے محسوس کیا۔اس کے ایک رشتہ دار نے بتایا کہ وہ تو فوج میں بھرتی ہوگیا ہے۔

ایک شخص نے کہا: بھئی یہ تو اس نے اچانک ہی قدم اٹھایا ہے ہمیں تو اس نے اپنے اس منصوبے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔

دوسرے نے کہا اس کا قد کاٹھ اور بھرپور جوانی فوج کی ہی امانت ہے۔ وہیں وہ کامیاب ہوگا۔

فوج میں شمولیت پر ہر کوئی اپنی رائے دے رہا تھا مگر میں ان کی سرگوشیوں کے دوران ہی اس نوجوان کی نظروں کا تصور کر کے کہیں دور جا نکلا تھا۔ اب مُجھ پر اُس کی آنکھوں میں موجود چمک اور اس کے سراپے میں موجود بے کلی کی حقیقت کُھلنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ تو کسی اور ہی منزل کا مسافر تھا۔ فوج میں شمولیت اختیار کرنا تو محض اس منزل کی طرف پہلا قدم تھا۔

میں نے پوچھا: وہ کون سی رجمنٹ میں گیا ہے۔

جواب ملا۔۔۔ پنجاب رجمنٹ۔

قارئین! پنجاب رجمنٹ پاک فوج کی سب سے سینئر رجمنٹ ہے۔ بہادری کا سب سے بڑا اعزاز ''نشانِ حیدر'' حاصل کرنے والے 10 میں سے چار دلیروں کا تعلق اسی رجمنٹ سے ہے۔ جن میں کیپٹن سرور شہید، میجر طفیل محمد شہید، میجر عزیز بھٹی شہید اور لانس نائیک محفوظ شہید شامل ہیں جنہوں نے مختلف محاذوں پر دفاعِ وطن کا فریضہ انجام دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا اور اپنی بہادری کے وہ انمٹ نشان چھوڑے جن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آج بھی ہمارے افسر اور جوان پاکستان کے دشمنوں کے ناپاک عزائم خاک میں ملانے میں مصروف ہیں۔ وہ قربانیوں کا سلسلہ جاری رکھ کر ہماری آزادی کو دوام بخش رہے ہیں۔

پاک فوج جہاں بیرونی سرحدوں کا دفاع کر رہی ہے اسی طرح گزشتہ ایک دہائی سے وطن عزیز کے اندر ہونے والی دہشت گردی پر قابو پانے کے لئے بھی برسرِ پیکار ہے۔ دہشت گردی کی جنگ اس حوالے سے انتہائی پیچیدہ ہے کہ اس میں دوست اور دشمن کی پہچان نہیں کر سکتے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ یہ دہشت گرد اسلام کے داعی اور اصل پیروکار ہونے کا تو دعویٰ کرتے ہیں مگر عملی طور پر فساد بپا کرنے میں بھی مصروف ہیں۔ وہ اپنے ہی تراشے 'اسلام' پر عمل کرنے والوں کو اپنا ساتھی اور باقی سب کو کافر تصور کرتے ہیں اور اقلیت میں رہ کر اکثریت پر قابو پانا چاہتے ہیں۔ ہم

دھماکوں، خودکش حملوں اور ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے مسلمانوں کا ہی خون بہا رہے ہیں۔ انہوں نے اسلام کے قلعے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اللہ اکبر کا نعرہ لگانے والی اور سبز ہلالی پرچم کی امین فوج ان کا سب سے بڑا نشانہ ہے۔ اس گروہ نے پاکستان کے خوبصورت شمالی علاقوں کو موت کی وادی میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور کچھ ہی عرصے بعد حکومت کی رٹ کو للکارنا شروع کر دیا۔ سیاسی پارٹیاں ان کے آگے بے بس ہوگئیں۔ سول انتظامیہ کو انہوں نے عضوِ معطل بنا دیا۔ ان حالات میں پاک فوج کو وہاں ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں اس خوبصورت نوجوان نے پاک فوج میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس کا نام محمد عدنان تھا۔ پنجاب رجمنٹل سنٹر مردان سے فوجی تربیت مکمل کرنے کے بعد جب سپاہی اس کے نام کا حصہ بنا تو وہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے اپنے لئے جو راستہ چنا ہے وہ خطرات سے بھرپور ہے۔ دورانِ تربیت ہی اسے اور اس کے ساتھیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ میدانِ جنگ ہی ان کا پہلا پڑاؤ ہوگا۔ وہ میدان جنگ جہاں دشمن اپنوں کے روپ میں ان پر وار کرے گا۔ جہاں ان کے ذہنوں کو طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا کیا جائے گا۔ جہاں براہ راست جنگ کے ساتھ ساتھ انہیں اعصابی ونفسیاتی جنگ کا سامنا بھی کرنا ہوگا۔ وطن عزیز کی خدمت کے جس جذبے کو لے کر وہ پاک فوج کا حصہ بنے تھے، اس کے تحت وہ اس طرح کے کسی بھی طوفان سے ٹکرا جانے کا بھرپور عزم رکھتے تھے۔

سپاہی محمد عدنان کو 69 پنجاب رجمنٹ میں تعینات کیا گیا جو اورکزئی ایجنسی میں دہشت گردوں کے خلاف نبرد آزما تھی۔ دہشت گرد گھات لگا کر حملہ کرتے اور وادی کی بھول بھلیوں میں غائب ہو جاتے۔ یونٹ کے افسروں اور جوانوں نے وہاں سے دہشت گردی کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ بہت سے دہشت گردوں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ انہوں نے دہشت گردی کے بہت سے نیٹ ورک توڑے جس پر دہشت گرد سٹپٹا کر رہ گئے تھے اور جوابی حملوں کے لئے پر تول رہے تھے۔ یونٹ نے بہت سے علاقوں سے دہشت گردوں کا صفایا کر کے وہاں اپنی چوکیاں قائم

کرلیں تھیں جہاں اس کے جوان ہر وقت مستعد اور ہوشیار رہتے۔ سپاہی عدنان دہشت گردوں کے خلاف ان تمام کارروائیوں میں پیش پیش رہا۔

21 دسمبر 2011ء کی صبح 4:00 کے قریب دہشت گردوں نے مختلف اطراف سے یونٹ کی پوسٹوں پر حملہ کر دیا۔ سپاہی عدنان کی پوسٹ بھی حملے کی زد میں آ گئی۔ جس طرح آئے روز دہشت گرد سیکورٹی فورسز پر حملے کر رہے تھے۔ پاک فوج کے سپاہی بھی ایسے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد اور تیار تھے۔ انہوں نے اپنے مورچے میں مستعدی سے جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ دہشت گردوں کے پاس مشین گنوں کے علاوہ ہینڈ گرنیڈز اور راکٹ لانچر بھی موجود تھے۔ مگر وہ پاک فوج کے جوانوں کی مستعدی اور دلیری کے سامنے بے بس نظر آ رہے تھے۔ شدید مزاحمت کے بعد ان کے حملے کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ دہشت گردوں نے مورچوں کو تاک تاک کر نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اسی دوران گولیوں کی ایک بوچھاڑ سپاہی عدنان کے سینے کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔

شدید زخمی ہونے کے باوجود اس نے مزاحمت جاری رکھی۔ وہ خون کی آخری بوند تک دہشت گردوں کے خلاف ڈٹا رہا اور آخر کار زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ منزل حاصل کر لی جس کی وہ تمنا رکھتا تھا۔ جس وقت اس دلیر سپاہی نے جان جانِ آفرین کے سپرد کی اس وقت اس کی عمر 20 سال تھی۔ ادھر دہشت گردوں کا حملہ بری طرح ناکام رہا تھا۔ سپاہی عدنان اور اس کے ساتھیوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دہشت گردوں کے عزائم ناکام بنا دیئے تھے۔

شہادت کی خبر اس کے آبائی گاؤں پہنچی تو اس کے والد امیر خان کی زبان پر الحمدللہ کے الفاظ تھے۔ وہ بھی پاک فوج سے بطور نائیک کلرک ریٹائر ہوئے تھے اور اپنے بیٹے کی شہادت پر صبر و شکر کا مجسمہ بنے ہوئے تھے۔ شہید کا گاؤں راولپنڈی سے 70 کلو میٹر فاصلے پر کڑائی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مشہور قصبہ چکری سے اس کا فاصلہ تقریباً 30 کلو میٹر ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں کے لوگوں کا ذریعہ معاش تو زمینداری ہے لیکن حسبِ روایت اکثر گھرانوں کے چشم و چراغ پاک

فوج سے وابستہ ہیں۔اس طرح دفاعِ وطن میں اس علاقے کے بیٹوں کا کردار سب سے نمایاں رہا ہے۔گاؤں کے ساتھ ہی ایک قبرستان ہے جہاں قومی پرچم میں ملبوس شہید کے جسدِ خاکی کو لایا گیا تو پاک فوج کے ایک چاق چوبند دستے نے اسے سلامی پیش کی۔شہید کی نمازِ جنازہ میں لوگوں کا ایک جمِ غفیر امڈ آیا تھا۔ہوا کے پرکیف جھونکوں نے شہید کے گاؤں کو حصار میں لے رکھا تھا اور ہر کوئی شہادت کے لہو کی مہک کو محسوس کر رہا تھا۔اس موقع پر شہید کے والد نے جو مختصر سی تقریر کی اس نے فضا کو اور بھی گرما دیا۔جواں سال بیٹے کی جدائی کے باوجود ان کا حوصلہ بلند اور وطن کی محبت سے سرشار تھا۔اس بلند ہمت باپ نے کہا: ''مجھے بیٹے کی جدائی کا دکھ ضرور ہے مگر مجھے اس کی وطن کے لئے شہادت اور بھی اچھی لگی''۔اس دوران شہید کے جسدِ خاکی کو وطن کی مٹی میں اتار دیا گیا۔شہید کی آخری آرمگاہ پر سبز ہلالی پرچم جس سرشاری اور شان سے لہرا رہا ہے وہ اس گاؤں، اس شہر اور اس ملک میں بسنے والے ہر شخص کے لئے باعثِ فخر ہے اور ہم سب کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ سپاہی محمد عدنان جیسے ایسے کئی جوانوں نے اس کی سربلندی کے لئے جو خدمات دیں ہیں، ہم بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے وطن کی آزادی اور وقار کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔سپاہی محمد عدنان کو اس کی بہادری اور جانثاری کے اعتراف میں تمغہء بسالت کے اعزاز سے نوازا گیا۔

وہ جو سرخرو ہوئے۔۔۔

شہید میجر عدیل شاہد (تمغۂ بسالت) کے حوالے سے ونگ کمانڈر محبوب حیدر (ریٹائرڈ) کی ایک تحریر

شہادت کسی مرگِ ناگہانی یا حادثاتی موت کا نام نہیں بلکہ یہ وہ رتبۂ بلند ہے جسے خداوندِ کریم اپنے منتخب بندوں کو عطا فرماتا ہے اور یہ حقیقت اس لمحے مزید واضح ہوگئی جب میری ملاقات شہید میجر عدیل شاہد کے والدِ گرامی سید شاہد حسین زیدی سے ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ تقسیمِ ہند کے وقت ہمارا خاندان ہندوستان کے مشہور شہر جے پور کے محلہ سادات سے ہجرت کر کے 1947 میں کراچی پہنچا۔ عدیل 7 اکتوبر 1986 کو اسی پاکستان کے سب سے زیادہ آبادی والے شہر کراچی میں پیدا ہوئے۔ عدیل نے کوئین میری سکول ملیر سے پرائمری تعلیم حاصل کی اور میٹرک، کے بی وی ماڈل سکول نمبر 1 نزد قائداعظم انٹرنیشنل ایئر پورٹ کراچی سے کیا۔ ایف ایس سی کا امتحان گورنمنٹ ڈگری کالج گلشن اقبال، کراچی سے پاس کیا۔ عدیل کے آرمی آفیسر بننے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونا لازم تھا۔ ہمیں میجر عدیل کی چھوٹی بہن زومیرا جسے وہ پیار سے زونی کہتا، نے بتایا کہ عدیل کا چوتھی جماعت ہی سے سب سے پسندیدہ کھیل بھی بڑا عجیب تھا۔ وہ کہتا میں پائلٹ آفیسر راشد منہاس بنتا ہوں اور اپنی بڑی بہن عمیرہ جسے لاڈ سے گڑیا پکارتا تھا، سے کہتا کہ گڑیا باجی آپ فلائٹ لیفٹیننٹ مطیع الرحمن ہو۔ آپ نے مجھے تکیہ مارنا ہے جس سے میں شہید ہو جاؤں گا اور زونی، آپ نے اپنے شہید بھائی کے اُوپر سفید چادر ڈال کر یہ نغمہ پڑھنا ہے۔

اے راہِ حق کے شہیدو وفا کی تصویرو
تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں

عدیل کبھی پائلٹ آفیسر راشد منہاس (نشانِ حیدر) بنتا تو کبھی میجر عزیز بھٹی شہید (نشانِ حیدر) کا

روپ دھارتا۔ جو بہن بھائی مل کر شہادت کو کھیل سمجھ کر کھیلیں، کس دشمن کی مجال ہے کہ ایسی قوم سے ٹکر لینے کی جرأت کر سکے۔

عدیل کے دل و دماغ میں آرمی آفیسر بننے کا یہی والہانہ شوق وجذبہ تھا کہ آپ 2007 میں پی ایم اے 119 لانگ کورس کے لئے منتخب ہو گئے اور 26 اپریل 2009 کو بی اے کی ڈگری حاصل کر کے پاکستان آرمی اکیڈمی کاکول سے پاس آؤٹ ہو کر آرمی ایئر ڈیفنس کور میں شامل ہو گئے۔

عدیل شہید کی پہلی پوسٹنگ اپریل 2009 میں 161 آر سی جی، ایئر ڈیفنس رجمنٹ سرگودھا میں ہوئی۔ جہاں آپ نے پانچ سال میں گنز کے ذریعے دشمن کے لڑاکا طیارے گرانے کی تربیت حاصل کی اور ساتھ ہی ایڈجوٹنٹ شپ، ٹروپ کمانڈر اور بیٹری کمانڈر جیسے اہم فرائض انتہائی جانفشانی اور لگن سے سرانجام دیئے اور اس دوران آپ 23 مارچ 2012 یومِ پاکستان کے مبارک موقع پر ترقی حاصل کر کے کیپٹن بن گئے۔ عدیل نے آر پی وی (Remotely Piloted Vehicle) کورس بڑی محنت سے امتیازی پوزیشن سے مکمل کیا۔ آپ کو دو ماہ کے لئے چین بھیجا گیا جہاں سے آپ نے ڈرون اڑانے، گرانے اور کنٹرول کرنے کا ایڈوانس کورس کیا، المختصر دورانِ سروس آپ کو کئی حساس مقامات اور سیاچن جیسے پُرخطر علاقوں میں بھی دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نوکری کرنے کا موقع ملا۔

6 ستمبر 2015 میں آپ کو انسٹرکٹر کی حیثیت سے سکول آف آرمی ایئر ڈیفنس ملیر میں پوسٹ کر دیا گیا تا کہ آپ اب تک حاصل کئے ہوئے علم کی قیمتی امانت کو باقی افسران اور جوانوں تک پہنچا سکیں۔ 23 مارچ 2017 یومِ پاکستان کو آپ ترقی پا کر میجر بن گئے۔ سب گھر والوں نے اس خوشی کو خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سادہ و پُروقار انداز میں منایا۔ آپ 17 اپریل 2017 تک ایک لائق اُستاد ہونے کی ذمے داری نبھاتے رہے۔ دو سال کے بعد آپ کو ایک مرتبہ پھر 161 آر سی جی، ایئر ڈیفنس رجمنٹ میں تعینات کر دیا گیا۔ اس طرح مجموعی طور پر

آپ دس سالوں میں ایئر ڈیفنس کور کے ایک تجربہ کار افسر بن گئے جس کی وجہ سے تمام آفیسرز اور جوان آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

یکم اپریل 2019 کو آپ ایف سی خیبر پختونخوا کی ایک کور نارتھ، مہمند رائفلز میں پوسٹ کر دیئے گئے۔ یہ پاک افغان سرحد کا انتہائی حساس علاقہ ہے۔ پاک افغان سرحد پر 1200 کلومیٹر کی آہنی باڑ لگانے کا کام کافی حد تک مکمل ہو چکا ہے۔اس باڑ کی تکمیل سے پاک افغان سرحد پر دہشت گردوں کی نقل وحرکت ختم ہو جائے گی لہٰذا دشمن ہرگز نہیں چاہتا کہ یہ کام مکمل ہو مگر پاک آرمی کی بھرپور کوشش ہے کہ باڑ کی تنصیب کا کام ہر قیمت پر جلد از جلد مکمل ہو جائے اس مقصد کے حصول کے لئے پہلے ہی ہمارے بہت سے جوان اور آفیسرز اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں۔اس علاقے میں دشمن چھپ کر بارودی سرنگیں بچھاتا رہتا ہے۔ 20 ستمبر 2019 کو بھی چند بارودی سرنگیں بچھے ہونے کی اطلاع ملی تھی جن کو ناکارہ بنانے کی ذمہ داری ایک بم ڈسپوزل اسکواڈ کو سونپی گئی تھی جس کا انچارج ایک کیپٹن کو بنایا گیا۔مگر اس موقع پر میجر عدیل نے رضاکارانہ طور پر خود بم اسکوارڈ سربراہ کی ذمہ داری قبول کی اور خطرناک سرچ آپریشن پر روانہ ہو گئے۔ابھی متعلقہ جگہ پر سرچ آپریشن جاری تھا کہ 12 بج کر 15 منٹ پر ایک بارودی سرنگ خوفناک دھماکے کے ساتھ پھٹ گئی۔عدیل کا پورا جسم اس کا نشانہ بنا اور گھٹنوں تک دونوں ٹانگیں دھماکے کی شدت سے ضائع ہو گئیں اور آپ اپنے ایک سپاہی فراز حسین کے ہمراہ درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے اور اسی طرح شہیدانِ وطن کی کہکشاں میں پاک فوج کے میجر اور سپاہی کی صورت میں دو درخشاں ستاروں کا مزید اضافہ ہو گیا۔

عدیل کو اپنے ادارے سے والہانہ وابستگی اور وارفتگی کا جذبہ والد سے ورثے میں ملا۔آپ کے والد سید شاہد حسین زیدی ''پاکستان سٹیل'' میں اکانومسٹ سیکرٹری اکاؤنٹیبلٹی جیسے اعلیٰ وکلیدی منصب پر فائز رہے اور مسلسل تیس سال تک اپنی گراں قدر خدمات سے ادارے کو مستفید فرماتے رہے۔آپ کے والد نے ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر رب

کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا بیٹا ابھی پانچویں جماعت ہی میں تھا اور اس نے اپنی عادت بنالی تھی کہ جب وہ سکول سے چھٹی کے بعد گھر لوٹتا تو صدر دروازے پر رُک جاتا اور داخل نہ ہوتا۔ تقاضا کرتا کہ ایک فوجی افسر گھر آیا ہے پہلے اسے سلیوٹ کیا جائے۔ اگر کوئی ٹالنے کے لئے یہ کہتا کہ آداب اب اندر تشریف لے آیئے تو کہتا کہ ایسے نہیں بلکہ پاؤں اٹھا کر زمین پر زور سے مارا جائے اور دایاں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر فوجی انداز میں شایانِ شان طریقے سے سلیوٹ کیا جائے اور جب ایسا کر دیا جاتا تو خوش ہو کر گھر میں داخل ہو جاتا۔

شہید کی ایک یہ بھی مخصوص عادت تھی کہ کمیشنڈ آفیسر بننے کے بعد بھی جب بھی چھٹیوں میں گھر آتا تو ماں کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ جاتا جیسے کوئی چھوٹا بچہ ہو اور پیار سے کہتا ماں مجھے اس طرح بہت سکون ملتا ہے۔ ایک دن ماں نے کہا بیٹا اب تم جوان ہو گئے ہو میں چاہتی ہوں کہ تمہاری شادی کر دی جائے اس معاملے میں اگر تمہاری کوئی تجویز ہے تو مجھے بتاؤ۔ کہنے لگا ماں جی آپ جہاں چاہیں میری شادی کر دیں لیکن مجھے خوشی ہوگی کہ اگر آپ میری شادی کسی فوجی افسر کی بیوہ سے کر دیں جو بے شک مجھ سے عمر میں بڑی ہو۔ لہٰذا والدین نے کیپٹن مجاہد بشیر شہید، ستارۂ بسالت کی بیوہ سے آپ کی شادی کر دی جو ضربِ عضب 2014 میں شہید ہوئے تھے اور اُن کی ایک بیٹی بھی ہے جس کی عمر اُس وقت ڈیڑھ سال تھی اور اب چار سال ہے، اس طرح ایک یتیم بچی کو دوبارہ باپ کا دستِ شفقت نصیب ہوا۔ بیٹی کا نام صبغۃ فاطمہ ہے۔ عدیل جب بھی چھٹی لے کر گھر آتا تو یہ بیٹی دن میں کئی بار اپنے باپ کا ماتھا چومتی اور عدیل بھی والہانہ انداز میں اُس کی پیشانی اور گالوں کے بوسے لیتا۔ اللہ نے عدیل کو بھی دو جڑواں بیٹیاں عطا فرمائیں جو اس وقت الحمدللہ دو دو سال کی ہیں، ایک کا نام زینب عدیل اور دوسری کا نام دعا عدیل ہے۔ خداوند ذوالجلال پاک فوج کے ہر شہید کو وقت سے پہلے آگاہ فرما دیتا ہے کہ اُسے شہادت کے منصب اعلیٰ کے واسطے منتخب کر لیا گیا ہے بعض اوقات یہ ادراک خواب کی صورت میں ہوتا ہے یا کشف کی شکل میں اُس کے گوشِ حقیقت شہادت کی آذان سن لیتے ہیں جس کی پکار پر وہ لبیک کہتا ہوا رزم گاہِ شہادت میں خوشی خوشی دوڑ کر

خود کو د پڑتا ہے۔ جیسا کہ قولِ سید الشہداء امام حسینؑ ہے کہ اگر زندگی کا اختتام موت پر ہے تو شہادت بہترین انتخاب ہے۔

اسی لئے بچوں کی ماں صالحہ جو دو مرتبہ بڑے جاگزیں صدموں سے گزری، وہ کہتی ہیں کہ شہادت سے ایک روز پہلے عدیل کا ایس ایم ایس آیا کہ میں اپنی فیملی سے بہت پیار کرتا ہوں۔ صالحہ میری شہادت کے بعد تم میری تینوں بیٹیوں اور پاپا کا خاص طور پر خیال رکھنا۔ اللہ حافظ! عدیل نے شہادت سے دو روز قبل اپنے پہلی جماعت کے کلاس فیلو کو بھی فون کیا اور اُس کی ماں سے کہا کہ خالہ جان آپ میری ماں کے انتقال کے بعد مجھے ماں کی طرح عزیز ہیں۔ میں عنقریب شہید ہو جاؤں گا لہذا آپ میرے لئے دعا کریں۔ خدا حافظ!

عدیل غریبوں کا درد رکھنے والا ایک نہایت شفیق اور مخلص انسان تھا۔ جب کبھی محلے سے گزرتے ہوئے بچوں کو گٹکا کھاتے ہوئے اور غلط مشاغل میں وقت ضائع کرتے ہوئے دیکھتا تو اُنہیں سمجھاتا۔ اُس کی اس پُرخلوص کوشش سے گلی محلے کے کئی بچے سُدھر گئے اور ان میں سے کچھ کو اس نے فوج میں بھی بھرتی کروایا۔ کچھ بچوں کو والد سے سفارش کر کے کراچی کے مختلف دفاتر میں نوکریاں دلوائیں۔ شہادت کے بعد میں پتہ چلا کہ چند بچوں کی تعلیم و تربیت اور علاج معالجے کا بھی خیال رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شہر کراچی میں اس کی شہادت کی خبر بڑی تیزی سے پھیلی اور بے شمار لوگوں اپنے ہیرو کی آخری جھلک دیکھنے اور جنازے کو کاندھا دینے کے لئے 21 ستمبر 2019 کو اُمنڈ آئے۔ گورنر، چیف منسٹر سندھ، کمانڈر کراچی کور، قومی وصوبائی اسمبلیوں کے ممبران، بیوروکریٹس اور بے شمار لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی اور اس کے بعد آپ کے جسدِ خاکی کو فوجی اعزاز سے وادیٔ حسینؑ قبرستان میں دفنا دیا گیا اور اپنے ہیرو کے لئے قوم کا یہ وہی سلیوٹ اور سلام تھا جس کی شہید عدیل کی روح کو پانچویں جماعت سے طلب تھی۔

ایک ہفتے کے بعد حسن اسکوائر پر دوبارہ عوام الناس اور سول سوسائٹی کے افراد نے ایک دعائیہ تقریب منعقد کی جو تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہی اور شہید کو خراجِ تحسین نذر کرنے کے لئے

چراغ روشن کئے گئے۔ جوان بچے، پڑھاپے میں والدین کا سہارا بنتے ہیں مگر آفرین ہے عدیل پر جو اپنی شہادت کے ذریعے سے ملک وملت کا سہارا بنا۔ اس نے اپنی جوانی قوم کی ترقی و یکجہتی اور امن کے لئے قربان کر دی۔ پاکستان کا بچہ بچہ اس کے لہو کا مقروض ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ اپنے محسن شہید کے خاندان کا حتی المقدور ہر قدم پر دکھ سُکھ میں ساتھ نبھائے گا۔ حکومتِ پاکستان نے میجر عدیل کو بعد از شہادت 23 مارچ 2020 میں تمغۂ بسالت سے نوازا۔

اس موقع پر شہید کے والد نے کہا کہ مجھے عدیل پر فخر ہے اگر میرے سو بیٹے بھی ہوں تو میں ملک وملت پر قربان کر دوں انہوں نے مزید کہا کہ میں عدیل کے نام پر ٹرسٹ بنا کر اس کے تعلیم وتربیت اور علاج معالجے کے مشن کو اپنی حیثیت کے مطابق آگے بڑھاؤں گا۔ شہید کی بیوہ نے کہا کہ پاپا اگر بیٹوں کی قربانی کا جذبہ رکھتے ہیں تو میں بھی اپنی تینوں بیٹیوں کو پڑھا لکھا کر پاک فوج کے حوالے کروں گی تا کہ اپنے باپ کی طرح ملک وقوم کی خدمت کر سکیں۔ بہنوں نے بھی عہد کیا کہ ہم اپنے شہید بھائی کے جاں نثاری اور جذبۂ حب الوطنی کے مشن کو آگے بڑھائیں گی۔

شہید کے بڑے بھائی نبیل بولے کہ میرا چھوٹا بھائی عدیل نہایت ملنسار، مخلص اور جری تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا وطن کی خاطر جان چلی جائے لیکن وطن کی ناموس پر آنچ نہیں آنے دوں گا اور وطن کے دشمنوں کو چُن چُن کر ٹھکانے لگاؤں گا۔

ایسی قوم جہاں شہداء کے والدین، بھائیوں، بہنوں اور شریکِ حیات کے عزم وحوصلے کا یہ عالم ہو وہ ہمیشہ ہر میدان میں فاتح وکامران رہے گی۔ ان شاء اللہ!!

شاہد عدیلؔ تیری شہادت پہ فخر ہے
ملت کو تیرے خوں کی حرارت پہ فخر ہے
قربان ہو کے ملک پہ، تو سرخرو ہوا
تیرا لہو وطن کی مرے آبرو ہوا
ہر روز بیٹیوں کو ترا انتظار ہے
گلشن میں اب تو صورتِ فصلِ بہار ہے

میرا فیلکن (Falcon)

جنگ ستمبر کے ہیرو ایم ایم عالم کی منہ بولی بیٹی خدیجہ محمود کی اپنے 'بابا' کے بارے میں ایک تحریر

مجھے لکھنا کبھی اتنا دشوار نہیں لگا جتنا اس وقت لگ رہا ہے۔ کیونکہ جس شخصیت کے بارے میں لکھنے کو کہا گیا ہے اس کا مقام میرے دل میں اور ہر محبِ وطن پاکستانی کے دل میں اتنا بلند ہے کہ اس شخص کی عظمت کے آگے نہ جانے کیوں اپنا ہر لفظ کم مایہ لگ رہا ہے اور بے یقینی کی وہ کیفیت ہے کہ نہ جانے حق ادا کر بھی پاؤں گی یا نہیں۔

محمد محمود عالم نام نہیں ایک عہد ہے۔ ایم ایم عالم سے میرا پہلا تعارف میری چھٹی جماعت کی اردو کی کتاب کے ایک باب یومِ دفاع سے ہوا جس میں جہاں دیگر غازیان اور شہداء میجر عزیز بھٹی شہید، سرفراز رفیقی شہید اور میجر شفقت بلوچ کا ذکر تھا، وہیں ایم ایم عالم کی اس فتح کا ذکر بھی تھا جس نے رہتی دنیا تک کے لئے ایک تاریخ رقم کر دی تھی۔ ایک منٹ سے کم وقت میں دشمن کے پانچ جہاز مار گرائے۔ یہ ناقابلِ یقین واقعہ ہوابازی کی تاریخ میں ایک معجزہ قرار دیا گیا اور دیومالائی کہانیوں کی تاریخ میں ایک شہزادے کے تصور نے حقیقت کا روپ بھرتے ہوئے ایک جیتے جاگتے ہیرو کا خاکہ ذہن میں بُننا شروع کیا اور ایک کھوج لگی جاننے کی۔۔۔ اور یہ ایم ایم عالم صاحب آخر کن کے جانشین ہیں۔ پڑھنا شروع کیا۔ امیر البحر خیر الدین بار بروسہ، قطلیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد اور ایسے کئی لازوال کردار کے جن کا یہ شاہین پیروکار بنا، جس کی پرواز کی شان و شوکت کے قصے لازوال رہیں گے۔ وقت گزرتا رہا اور ایم ایم عالم سے ملنے کا جنون بڑھتا رہا۔ ایک نجی ٹی وی چینل کے لئے کچھ کام کر رہی تھی کہ مجھے چھ ستمبر پر دستاویزی فلم بنانے کا حکم ملا۔ ایم ایم عالم

سے ملنے کی ایک امید نظر آئی اور اس طرح زندگی کا ایک اور نیا باب کھلا۔ 4 ستمبر 2005 کو پی اے ایف بیس فیصل میں فالکن 2 بلاک میں کونے والے کمرے میں، جہاں اس شاہین کا بسیرا تھا، کہ جس کا مقروض آج بھی پورا پاکستان ہے، اور تاقیامت رہے گا، اپنی ٹیم کے ساتھ پہنچی۔ عالم صاحب سے اس کارنامے کی بات شروع ہوئی کہ جس پر آج تک عقل حیران رہتی ہے۔ آواز میں وہی جوش اور ولولہ تھا۔ غازیٔ ملت ایم ایم عالم جب وہ واقعہ سنا رہے تھے تو کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ 40 برس قبل کا ذکر ہے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی 40 سیکنڈ قبل دشمن کے 5 جہازوں کو نیست و نابود کر کے لوٹے ہیں، لیکن ان الفاظ کے بعد ایک خاموشی چھا گئی ''ہم تو لوٹ آئے۔ رفیقی اپنے رفیق کے ساتھ شہید ہو گئے۔'' ریکارڈنگ ختم کرنے کے بعد میں نے عالم صاحب سے پوچھا کیا دوبارہ ملاقات کا اعزاز مل سکتا ہے۔ انہوں نے کاغذ پر اپنا نمبر لکھا اور مجھے دیتے ہوئے کہا۔ فون کر کے معلوم کر لیجئے گا۔ اگر آپ کی ڈاکومنٹری ہمیں اچھی لگی تو دوبارہ ضرور ملیں گے۔

بہت عجیب شرط رکھ دی گئی ملاقات کی۔ دو دن بعد 6 ستمبر کو ڈاکومنٹری آن ایئر ہوئی۔ 7 ستمبر کو ڈرتے ڈرتے فون کیا۔ اپنا تعارف کروایا۔ جواب ملا! ہاں ہاں ہمیں یاد ہے، کب آنا چاہیں گی؟ ''سر آج ہی آجاؤں'' کچھ ہمت بندھی۔ ''ہاں عصر کے بعد آجائیے گا۔'' اور میرے منہ سے اس وقت وہ الفاظ نکل گئے جن سے میں بچپن سے اپنے ہیرو کو بلایا کرتی تھی۔ تھینک یو سو مچ فالکن شام کو اپنی امی کے ساتھ ملنے گئی۔ ایک طویل نشست کے بعد جب اجازت چاہی تو کہنے لگے۔ ''ہماری بیٹی بنو گی۔'' بہت عرصے بعد یوم دفاع پر کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جس کو دیکھ کر ایک بار پھر یقین ہو گیا کہ ابھی بھی مٹی زرخیز ہے۔ یہ کہا اور ''ہمیشہ خوش رہو بیٹا۔'' کہہ کر میرا ماتھا چوم لیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، کہ کیا دعائیں ایسے بھی قبول ہوتی ہیں۔ پھر وہ ساری دنیا کے لئے ایم ایم عالم صاحب رہے۔ لیکن میرے فالکن تھے۔ اور اسی نام سے آخری وقت تک میں انہیں پکارتی رہی۔ 7 ستمبر 2005 کو اس شاہین نے اپنے پروں کی پُرشفقت آغوش میں بیٹی کہہ کر ایسا سمیٹا کہ پھر ہر اتوار کو ایک سے دو گھنٹے جا کر ان کے پاس بیٹھنا لازمی ہو گیا۔ بہت کچھ سیکھا ان سے اور کچھ ایسی چیزوں کا

تجربہ ہوا جو عام انسان کی عقل ذرا مشکل سے ہی تسلیم کرتی ہے۔شہید کا جو رتبہ ہے اور اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے انعام واکرام کس طرح کے ہوتے ہیں۔وہ ہماری دنیاوی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔لیکن ایک غازی اور مجاہد کا چہرہ کیسا ہوتا ہے اس کے چہرے سے نور کی کیسی کرنیں پھوٹتی ہیں' یہ میں نے اپنے فالکن کو دیکھا اور سیکھا کہ آنکھوں سے جو شعاعیں نکلتی ہیں ان کی آنکھوں میں زیادہ دیر تک نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔صحیح کہا تھا اقبال نے

؎ یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

فالکن کے ساتھ گفتگو کرتے وقت جب پاکستان کا ذکر آتا تو وہ ہمیشہ ہی کہتے لوگ سمجھتے تھے کہ ہم بنگلہ دیش چلے جائیں گے۔آپ دیکھئے گا ہم پاکستان کی مٹی میں ہی دفن ہوں گے۔

میں ان دنوں ایک یونیورسٹی میں پڑھاتی تھی اور ہر 6 ستمبر کو میں اپنے طالب علموں کے ساتھ فالکن کو سیلوٹ کرنے جاتی تھی کہ آج کی نسل کو بھی یاد رہے کہ ہماری تقدیر امم شمشیر وسناں ہے طاؤس ورباب نہیں۔فالکن ان کو بھی یہی کہتے تھے کہ کبھی مایوس نہ ہونا' جو کرسکتے ہو پاکستان کے لئے وہ ضرور کرنا' یہ مت سوچنا کہ ہمارے اکیلے کر لینے سے کچھ نہیں ہوگا۔پھر وہ ہم سب کو ٹافیاں دیتے تھے جو وہ میرے لئے سنبھال کر رکھتے تھے۔ان کے کمرے میں ایک ٹافیوں کا جار رکھا ہوتا تھا اور میں وہ ٹافیاں تبرک سمجھ کر کھاتی تھی۔لکھنے بیٹھوں اور صفحوں کے صفحے بھر جائیں لیکن الفاظ اور ذہن ساتھ نہیں دے رہے۔آنسوؤں کی دھند کے پار صفحہ دھندلا ہو رہا ہے۔یہ سوچ کر کہ فالکن یہ مضمون میں آپ کی یاد میں لکھ رہی ہوں۔

اور پھر ایک دن خبر ملی کہ دنیا کا عظیم جنگی ہیرو ایم ایم عالم بستر علالت پر ہے۔میں رہ نہ سکی۔کس طرح پی این ایس پہنچی؟ یہ ایک الگ کہانی ہے۔وہاں جا کر جب فالکن کو بستر پر دیکھا تو آنسوؤں پر قابو نہ پاسکی۔کیونکہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں ملنے جاؤں اور فالکن دروازے پر کھڑے میرا انتظار نہ کر رہے ہوں۔مجھے روتا دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور تھوڑی کمزور آواز میں بولے ''آپ جانتی ہیں، ہم اپنی بیٹی کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتے، کیوں تکلیف دے رہی ہیں ہمیں۔آیئے ہمارے ساتھ بیٹھیں

اور پھر اپنے کاندھے سے میرا سر لگا کر بولے ''بیٹیاں مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔'' کچھ دن کے بعد عید آ گئی۔عید بھی اپنے فالکن کے ساتھ منائی۔دو تین دن کے بعد خبر ملی کہ طبیعت پھر خراب ہوگئی ہے اور آئی سی یو میں داخل ہو گئے ہیں۔بہت کوشش کے باوجود نہ بات ہوسکی نہ ملنے کی اجازت ملی۔ایک دن فالکن کے نمبر سے فون آیا،کوئی ڈاکٹر صاحب تھے کہ سر عالم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔لیکن مختصر بات کیجئے گا۔میں نے بات کی ان کی نحیف آواز آئی ''ہماری بیٹی کیسی ہے؟'' میں رو پڑی پھر یہ آواز آئی '' آپ روئیں نہیں، آپ کی ہنستی ہوئی آواز ہمیں اچھی لگتی ہے۔جب آپ سے بات نہیں ہوتی تو آپ کی آواز ہمارے کانوں میں گونجتی ہے،آپ کی ٹافیاں بھی رکھی ہیں'' اور پھر ان کی سانس اکھڑنے لگی۔ڈاکٹر نے اُن سے فون لے کر مجھے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

18 مارچ 2013 صبح آٹھ بجے مجھے فون آیا اور بتایا گیا کہ وہ شاہین جس نے اتنے سال مجھے اپنے پروں کی آغوش میں رکھا،وہ اپنی ابدی منزل کی جانب پرواز کر گیا ہے۔ہم ابھی جنازے کی خبر کا اعلان نہیں کر رہے لیکن آپ کو وہ بیٹی بلاتے تھے،اس لئے اُن کی آخری رسومات کے لئے جو ماڑی پور ایئر بیس میں ہونی ہیں،ہماری گاڑی آپ کو لینے آجائے گی۔

کچھ پتہ نہیں چلتا کب عقاب مرتے ہیں
کرگسوں کی بستی میں ذکر تک نہیں ہوتا
پر فضا تڑپتی ہے جب عقاب مرتے ہیں
تمہاری قبر پر میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
وہ تم کب تھے
کوئی سوکھا ہوا پتہ ہوا سے ہل کے ٹوٹا تھا

پُراسرار بندے

طاہر محمود

وہ اُسے ہسپتال کے دروازے پر ملا۔ پاک فوج کی وردی دیکھ کر اُس بوڑھے شخص سے رہا نہ گیا۔ ٹھک سے سیلوٹ مارا۔ دونوں اجنبیوں میں بات چیت شروع ہوگئی۔ بہت جلد دونوں کے درمیان محبت کا وہ رشتہ استوار ہو چکا تھا جو وردی والوں کا خاصہ ہے۔ یہ پاک فوج کی وردی پہنے ہوئے تھا اور وہ دو جنگوں کا غازی۔ حوالدار فضل داد نام بتایا اس نے۔ تھوڑی ہی دیر بعد غازی سپاہی اپنی جوش اور جذبے سے بھرپور آواز میں 1965 اور 1971 کی جنگ کے واقعات سنا رہا تھا۔ 1965 کی جنگ اس نے وَن ایف ایف رجمنٹ جبکہ 1971 کی جنگ 35 ایف ایف رجمنٹ کے ساتھ لڑی تھی۔ بوڑھا سپاہی جو پچاسی سال کے پیٹے میں تھا، اپنی بیماری اور جسمانی دردوں کو بھلا چکا تھا۔ اس نے بہت سی باتیں بہت کم وقت میں کہہ دیں کیونکہ اُس نے اپنے گاؤں چک بیلی خان کی بس میں بیٹھنا تھا۔ 1965 کی جنگ میں اکھنور کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آواز میں ایک حسرت تھی کہ یہ شہر بس پاک فوج کے قبضے میں آتے آتے رہ گیا۔ چھمب جوڑیاں کے محاذوں کی فتوحات پر وہ نازاں تھا۔ پھر اس نے 1971 کی جنگ کا ذکر شروع کیا۔ پہلے جملے سے گفتگو اور سفر کے اختتام تک وہ اپنے کمانڈنگ آفیسر (CO) لیفٹیننٹ کرنل راجہ اکرم شہید کی بہادری، ایمانداری اور سپاہیانہ شان کی باتیں کرتا رہا۔ اُس نے بتایا کہ کس طرح دشمن نے ظفروال سیکٹر (شکرگڑھ) پر ٹینکوں کی ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ فضل داد چونکہ کمانڈو ٹریننگ کر چکا تھا، تو کمانڈنگ آفیسر نے اس کے سیکشن کو اپنے ساتھ رکھا۔ اس نے بتایا کہ اُس کا CO بہت نمازی، پرہیزگار اور بااصول لیڈر تھا۔ وہ اپنے جوانوں پر جان چھڑکتا تھا مگر ڈسپلن کے معاملے

میں بے حد سخت تھا۔ اسلام کے اعلیٰ اصولوں پر بہت سختی سے کاربند رہتا تھا۔ مگر اس کے ایمان کی اصلی طاقت تو میدانِ جنگ میں نظر آئی۔ وہ لڑائی کے میدان میں نماز ادا کرتے بھی نظر آیا اور دشمن کو للکارتا ہوا بھی کہ ''اگر کسی نے پاک سرزمین پر حملہ کرنے کی جرأت کی تو واپس نہ جا سکے گا''۔ اس کے جوشیلے پن، وطن سے محبت، اور ایمان کی طاقت پر اُس کی سپاہ کا یقین غیر متزلزل رہا۔ وہ سب کے سب میدان میں ڈٹ گئے۔ دشمن اپنے ٹینکوں کی ٹولیاں ایک ایک کر کے آگے بڑھاتا رہا کہ شاید ان کا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ مگر پاکستان کے یہ سپاہی، اپنے ملک، فوج اور وردی کی عظمت پر مرمٹنے والے، مرتے رہے، مارتے رہے مگر ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے۔ لڑائی کے اختتام تک ساٹھ سے زیادہ جامِ شہادت نوش کر چکے تھے اور سیکڑوں زخمی تھے، مگر میدانِ جنگ، دشمن کا قبرستان بن چکا تھا۔ پھر فضل داد نے ایک انوکھی شان اور ایمانی جذبے سے اپنے کمانڈنگ آفیسر راجہ اکرم کی شہادت کا واقعہ بیان کیا۔ اس کا کمانڈنگ آفیسر جو سپاہیانہ بہادری اور جرأت کا نمونہ تھا، ہمہ وقت اگلے مورچوں میں موجود رہا۔ خود دشمن کے ٹینکوں پر فائر کراتا رہا۔ پھر وہ وقت بھی آسمان نے دیکھا کہ دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا۔ وہ دوزانوں بیٹھا ہوا تھا۔ دشمن کی گولیاں اُسے گرا نہ سکیں۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی زخمی چھاتی کا لہو اپنی داڑھی مبارک پر ملا، پاک لہو شہید کے چہرے کا نور بنا۔۔۔ پھر اُس نے ایک نگاہ اپنی سپاہ پر ڈالی، بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھا اور آخری سانس لئے، وہ شہید ہو چکا تھا مگر ابھی تک دوزانوں بیٹھا تھا جیسے حالتِ نماز میں ہو۔

فضل داد کی منزل آ چکی تھی۔ دونوں وردی والوں نے ایک دوسرے کو محبت اور فخر سے الوداع کیا۔ اس لمحے دونوں کو دھرتی کی فضاؤں میں محبت کا فخر چار سو پھیلتا نظر آیا۔ وطن سے محبت، وردی سے محبت، ایمان سے محبت، روشنی کا ایک پُر اسرار ہالہ چار سُو پھیل چکا تھا۔

ہم آگے بڑھیں گے

زیب النساء

میرے اِرد گرد برف پوش پہاڑ، لہلہاتے کھیت اور مسحور کُن نظارے قدرت کی کریمی کا مظہر ہیں اور ان میں بسنے والی مخلوق جن میں کسی کو اللہ نے خواہش، کسی کو عقل اور صرف ایک کو یعنی اشرف المخلوقات انسان کو عقل اور خواہش دونوں عطا کی ہیں یہ عطائیں اللہ کی بڑائی اور کبریائی کی جاودانہ مثال ہیں۔ لیکن جہاں انسان کو عقل اور خواہش کے تحفے عطا فرمائے وہاں اس کے اندر حرص، لالچ، نفسانی خواہشات اور مال و متاع کی چاہت جیسی بُرائیاں بھی پیدا کیں اور ایک باریک لکیر کے ذریعے نیکی اور بدی میں فرق بتایا اور اس کے ساتھ ساتھ نفس اور خواہشات کو قابو کرنے کا چارٹر بھی تھما دیا اور بتایا کہ ہر انسان کی عزت و تکریم ایک دوسرے پر فرض ہے۔ لیکن میرے اِرد گرد کا ماحول دھماکوں، چیخوں، سسکیوں، لہولہان کفن و تابوت سے اَٹا پڑا ہوا ہے۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں اور پھر انسان کے کرتُوتوں کو دیکھ کر مُجھے انسانیت اور انسان ہونے پر شرم محسوس ہوتی ہے۔ میں اور کزئی ایجنسی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ٹیچر ہوں۔ ایک استاد ہونے کے ناتے میرا یہ ایمان ہے کہ اِن تمام بُرائیوں کی جڑ صرف تعلیم سے محرومی ہے۔ یہی کمی انسان کو نفس کا غلام اور پھر حیوان بنا رہی ہے اور آہستہ آہستہ یہی روش درندگی میں تبدیل ہوتے ہوتے آگے ہی بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن مجھے کامل یقین ہے کہ تعلیم ہی ایسا تریاق ہے جس کا صحیح استعمال انسان کو انسانیت کے عظیم مرتبے پر پہنچاتا ہے اور اُس کی درندگی کو انسانی احساسات، خُدا ترسی اور دردِ دل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

ہمارے علاقے میں فوج کی آمد کے بعد عام لوگوں کو یہ احساس ہونا شروع ہوا کہ زندگی جینے کا

نام ہے اور اس دنیا میں رہنے والے بہت سے لوگ انسانیت کے اعلیٰ معیار پر بھی فائز ہیں اور یہی لوگ ڈھکے چھپے یا ظاہری طور پر انسانوں کا دُکھ درد بھی بانٹتے ہیں۔ اورکزئی ایجنسی میں زیادہ تر لوگ کاشتکاری سے منسلک ہیں اور محنت اور لگن ان کا شعار ہے۔ زندگی گزارنے کا شعور، انسانیت کا احترام اور اس کی حفاظت ہمارا وہ طرۂ امتیاز ہے جس کا دفاع بھی اہم اور ضروری ہے۔ لیکن دوسری جانب ان خواہشات اور احساسات کے دشمن بھی کم نہیں اور اُن کی منشاء اور مرضی صرف اور صرف اپنی بالا دستی اور حکومت کو قائم کرنا ہے چاہے اُنھیں انسانیت کے معیار سے کتنا ہی نیچے گرنا پڑے۔ یہ کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے جب اس علاقے میں ظلم اور بربریت کا دور دورہ تھا' علاقے میں ماتم، کفن، تابوت اور سر بریدہ لاشیں عام تھیں اور انسان دوسرے انسانوں کو چیلوں اور درندوں کی مانند نوچ کر کھا رہے تھے۔ لیکن یہ تمام حالات فوج کی آمد سے یکدم بدل گئے اور شیطانیت آہستہ آہستہ کہیں غائب سی ہوگئی اور علاقے میں امن قائم ہونا شروع ہوا۔ لوگوں کے چولھوں میں آگ جلنا شروع ہوئی' کاروبارِ حیات رواں ہوا اور زندگی کی گاڑی نے ایک دفعہ پھر منزل کا انتخاب کیا اور اس پر گامزن ہوگئی۔ میرے بہادر بھائیوں کی آمد سے میرے سر پر بھی دوبارہ چادر آئی اور میں بھی اپنے علاقے کے بچوں کو تعلیم جیسے زیور سے آراستہ کرنے چل پڑی۔ لیکن یہ راستہ اتنا آسان بھی نہیں۔ ابھی کل کی ہی بات ہے فوج والوں نے ہمارے بڑوں کو اپنے پاس بلایا اور انھیں اس بات کی نوید دی کہ علاقے میں بجلی، پانی کی فراہمی اور سکولوں کی مرمت کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کام کو کسی منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے اُن کو ہمارے علاقے کے عوام کی مدد درکار ہے۔ یہ بات جب میرے کانوں تک پہنچی تو میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو نکل گئے اور زبان سے اِن فرشتہ صفت انسانوں کے لئے دعائیں نکلیں جو اپنے گھروں سے دور ہونے کے باوجود، انسانیت کے احترام اور بھلائی کے جذبے سے سرشار ہیں۔

مُجھے میرے علاقے کے مشران نے یہ بھی بتایا کہ فوج کے کُچھ اعلیٰ افسران پولیٹیکل انتظامیہ کے ہمراہ دو دن کے بعد ہمارے سکول آئیں گے اور بچوں میں مُفت کتابیں اور کاپیاں وغیرہ بھی

تقسیم کریں گے۔اس علاقے میں فری میڈیکل کیمپ بھی لگایا جائے گا اور لوگوں میں مفت دوائیاں بھی تقسیم کی جائیں گی۔سکول سے چُھٹی کے بعد میں خوشی خوشی گھر آئی۔گھر آ کر میں نے اپنے خاوند اور تمام گاؤں والوں کو یہ خوشی کی خبر سُنائی اور پھر اپنے طالبعلموں کی لسٹ بنائی اور ان کے لئے خصوصی ہدایات اپنی ڈائری میں درج کیں۔اگلی صُبح میں مقررہ وقت سے پہلے ہی سکول پہنچ گئی تھی اور بڑی بے صبری سے اپنے شاگردوں کا انتظار کر رہی تھی۔اس دن نہ جانے کیوں کام کرنے کی خواہش، جذبہ اور ولولہ انتہائی حد تک بڑھ چُکا تھا۔میرے علاوہ تمام دوسری ٹیچرز اور اسٹوڈنٹ بہت محنت کے ساتھ سکول کو سجا رہے تھے۔اب ہمیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ اس علاقے کی قسمت بدلنے والی ہے اور یہ صرف فوج ہی کے مرہونِ منت تھا۔سکول سے چھٹی عموماً دو بجے ہو جاتی ہے لیکن اس دن تمام لوگ بشمول طالبعلموں نے شام ساڑھے چار بجے چُھٹی کی اور اگلے دِن جلدی آنے کی ہدایات کے ساتھ اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ 12 دسمبر کی صبح تھی ہم لوگ ساڑھے سات بجے ہی سکول پہنچ گئے اور تمام انتظامات کو حتمی شکل دینے میں مصروف ہو گئے۔ہمیں بتایا گیا کہ دن کے ساڑھے گیارہ بجے مہمانِ خصوصی تشریف لائیں گے۔ابھی ایک گھنٹہ ہی گُزرا تھا کہ علاقے میں دو بڑے دھماکوں کی آواز آئی۔کُچھ دیر کے بعد پتہ چلا کہ ہمارے فوجی بھائیوں پر شر پسندوں نے دو مہلک دھماکے IED کی صورت میں کئے ہیں۔یہ سنتے ہی میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور میں دِل ہی دِل میں سوچنے لگی کہ اس علاقے کی جہالت کی وجہ صرف ہم ہی ہیں کیونکہ یہ شر پسند لوگ اسی ایجنسی کے رہنے والے تھے یا باہر کے لوگوں کو پناہ دی تھی۔یہ وہ فسادی تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ کسی بھی صورت یہ علاقہ ترقی کرے اور غریب کا بچہ پڑھ کر اُن کے مدِمقابل کھڑا ہو۔میرے دائیں بائیں میرے شاگردوں کا حصار تھا جو بے یقینی کی سی کیفیت میں تھے کہ اب کیا ہو گا؟ کیا اُن کے مقدر میں یہی دھماکے، لہولہان اور بے گور و کفن لاشے ہی ہیں؟ ابھی ہم انہی وسوسوں کا شکار تھے کہ ہمیں بتایا گیا کہ کسی بھی صورت میں طے شدہ پروگرام منسوخ نہیں ہو گا۔کیونکہ اس پروگرام کا انعقاد نہ صرف شیطانیت کے منہ پر طمانچہ ہے بلکہ اس سوچ کی نفی بھی ہے جس کا اس علاقے میں عرصہ دراز

سے راج ہے۔اس پیغام نے ہمیں ڈھارس دی اور بوجھل دل کے ساتھ تمام ٹیچرز نے دوبارہ کام شروع کر دیا۔

دن کے ساڑھے گیارہ بجے ہمیں یہ نوید پہنچائی گئی کہ مہمانِ خصوصی بریگیڈئر آصف سید جیلانی، سیکٹر کمانڈر آچکے ہیں۔ان تمام لوگوں کے چہروں پر ایک عجیب چمک اور خوشی تھی ان کی آنکھوں کی چمک ان کے کردار کی غماز تھی اور ان کے چہروں پر کھلی مسکراہٹ ان بہادر ماؤں کی تربیت کی ترجمانی کر رہی تھیں جن کے سپوت غیر معمولی حالات میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے اہل اور قابل تھے۔ یہ لوگ تمام بچیوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ رکھ رہے تھے اور اُن کو قلم اور کتابوں کا تحفہ دے رہے تھے ایسے میں میرے دل نے سوچا کہ ہم لوگ کس قسم کے انسان ہیں؟ ہم تو غیور پٹھان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن یہ اجنبی ہمیں کیسے تحفے دے رہے ہیں اور ہم جواباً اُن لوگوں کو انہیں کے جوانوں کے لاشے، تابوت اور سر بریدہ لاشیں تھما رہے ہیں۔لیکن یہ میرا ایمان ہے کہ یہی لوگ اُمید کی وہ واحد کرن ہیں جن کی موجودگی علاقے میں امن کی ضامن ہے اور انھیں لوگوں کی وساطت سے ایک دِن ہم بھی دنیا و عالم میں اپنی حیثیت منوائیں گے۔ کیونکہ اگر اِسی علم نے کفر و جہالت کو یکسر تبدیل کر کے اہلِ عرب کو دنیا کے ہر کونے میں متعارف کروایا تھا تو ہم تو دین اسلام کے پیروکار ہیں جس کی شروعات ہی لفظ ''اِقراء'' سے ہوئی۔ضرورت صرف نیت، احساس اور پُختہ عزم کی ہے۔

دھرتی گواہ رہنا

سیدہ شاہدہ شاہ

ہاتھوں پر گرم دستانے پہنے شانے پر گن لٹکائے نائیک جاوید اختر سینہ تانے، وادیٔ کشمیر کے برف پوش سر بفلک پہاڑوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جنوری کی خون جما دینے والی سردی اور اس پر طُرہ یہ کہ برف پوش پہاڑوں کی طرف چلنے والی یخ بستہ ہوائیں جسم کو چھیدے جا رہی تھیں۔ نائیک جاوید اختر کے جسم پر مخصوص فوجی یونیفارم، جرسی، فوجی جیکٹ اور اوورکوٹ اگرچہ موسم کی یخ بستگی کا کافی حد تک مقابلہ کر رہا تھا۔ مگر برفانی پہاڑوں کی طرف سے آنے والی سرد ہوائیں اتنے دبیز اور گرم کپڑوں میں بھی در آ رہی تھیں۔ مگر پچیس سالہ نائیک جاوید اختر رگوں میں خون جما دینے والی سردی سے بے نیاز انتہائی مستعدی سے کشمیر کے بارڈر پر پہرہ دے رہا تھا۔ ایک ماہ پہلے ہی اُس کی شادی ہوئی تھی۔ ابھی اُن کی بیوی کے ہاتھوں کے حنائی رنگ پھیکے بھی نہ ہوئے تھے کہ نائیک جاوید اختر کو فوری طور پر یونٹ میں رپورٹ کرنے کا کہا گیا۔ اور رپورٹ کرنے کے ٹھیک تیسرے دن ان کی یونٹ کو مخدوش حالات کے پیش نظر کشمیر کے بارڈر پر بھیج دیا گیا۔

رات کی تنہائیاں ہوں، آنکھوں سے نیند ہویدا ہو، آس پاس کوئی بھی نہ ہو اور پوری کائنات خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی ہو تو خیالات و تصورات کا ذہن کی سکرین پر ایک فلم کی طرح چلنا لازمی اور فطری امر ہو جاتا ہے۔ نائیک جاوید اختر بھی اپنے گاؤں اپنے گھر سے کوسوں دور شانے پر اسٹین گن اٹھائے اگرچہ وطن کی سرحدوں پر پہرہ دے رہا تھا اور بظاہر اس کی نظریں دور وادیٔ کشمیر کے برف پوش پہاڑوں پر دشمن کو کھوج رہی تھیں۔ مگر اس کے ذہن میں یادوں کی بارات سجی ہوئی تھی۔

نائیک جاوید اختر جہلم شہر کے ایک دور افتادہ گاؤں سنگھوئی کا رہنے والا تھا۔ضلع جہلم کے اس گاؤں کے زیادہ تر لوگوں کا ذریعہ معاش فوج کی ملازمت تھا۔اسی وجہ سے یہ علاقہ مارشل ایریا کہلاتا تھا۔نائیک جاوید اختر کے والد اگرچہ وسیع وعریض زرعی اراضی کے مالک تھے۔تاہم انہوں نے بھی اپنے آباء واجداد کی طرح ذریعہ معاش فوجی ملازمت کو ہی بنایا اور ایک طویل عرصہ عسکری خدمات انجام دینے کے بعد آنریری کیپٹن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔نائیک جاوید اختر نے بھی ایف اے کے بعد فوج میں کمیشن کے لئے اپلائی کر دیا۔تاہم وہ اپنے آخری عسکری ٹیسٹ آئی ایس ایس بی میں ناکام ہوگیا۔مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور افواجِ پاکستان میں بحیثیت سپاہی شمولیت اختیار کر لی۔ملک کی سالمیت سے محبت اسے ورثے میں ملی تھی۔وطن سے محبت اُس کے دل کی شریانوں میں سرخ لہو کی طرح رواں تھی۔یہی وجہ تھی کہ باوجود گاؤں میں ایک وسیع زرعی اراضی ہونے کے باوجود اُس نے فوج کی ملازمت اختیار کرنے کو ترجیح دی۔

نائیک جاوید اختر کے عسکری اوصاف ٹریننگ میں ہی عیاں ہونے لگے۔وہ ٹریننگ سنٹر کا مانا ہوا کھلاڑی اور ایک بہترین نشانہ باز بھی تھا۔ہر قسم کے ہتھیار چلانے کے فن کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ہدف پر نشانہ بھی اس خوبصورتی سے اور درستگی سے لگاتا کہ اپنے ٹریننگ دینے والے اساتذہ کو بھی حیران کر دیتا۔ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد جب وہ یونٹ میں پوسٹ ہوا تو اس کے جوہر اور بھی کُھل کر سامنے آنے لگے۔اپنی عسکری زندگی کے اس مختصر سے دور میں ہی وہ کئی بار ماہر نشانچی کے اعزازات جیت چکا تھا۔اپنی انہی صلاحیتوں کی بدولت وہ اپنے آفیسرانِ بالا کی نظر میں انتہائی مقبول اور ہر دلعزیز تھا۔جب وہ نائیک بنا تو ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔چنانچہ خاندان میں ایک اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس کی شادی کر دی گئی۔سات بہن بھائیوں میں اس کا نمبر تیسرا تھا۔شادی بیاہ میں تو جی بھر کر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔خصوصاً گاؤں کی شادیوں میں تو لوگ ہفتوں پہلے دنیا جہاں کی خوشیاں منانے کے لئے طرح طرح کی رسومات و رواج تخلیق کر لینے کے بہانے ڈھونڈنے لگتے ہیں۔مایاں، مہندی، ڈھولک کی تھاپ پر دولہا دلہن کے گھر آنا جانا۔اور رات گئے

تک لڑکیوں کا ڈھولک کی تھاپ پر شادی بیاہ کے رومان انگیز بابل کا انگنا چھوڑ کر پیا دیس سدھارنے والی دلہن کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے فراق میں درد والم بھرے گیت' پیا ملن کے محبت بھرے نغموں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ نائیک جاوید اختر کی شادی پر بھی اس کے بہن بھائیوں' عزیز واقارب اور برادری کے لوگوں نے یہی سب کچھ کرنے کا سوچا تھا۔ مگر انہی دنوں ملکی حالات اچانک خراب ہو گئے۔ سرحدوں پر جنگ کے مہیب بادل چھانے لگے۔ فضاؤں میں گولہ بارود اور لہو کی بو گھلنے لگی۔ ان حالات میں ایک عسکری فرد کو چھٹی نہیں ملا کرتی بلکہ اسے حکم ملا کرتا ہے تا کہ مختصر سے وقت کے نوٹس پر وہ محاذِ جنگ کی طرف کوچ کر سکے۔ نائیک جاوید اختر بھی ایک فوجی تھا۔ اس کے دل میں اگرچہ شادی کے بے پناہ ارمان تھے مگر وطن کی سرحدوں پر جنگ کے مہیب بادلوں کو منڈلاتے دیکھ کر اس نے گھر والوں کو شادی کی تاریخ مقرر کرنے سے منع کر دیا۔ لیکن تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ یوں بھی گاؤں میں شادیوں کا یوں ملتوی ہونا اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اس کے والد ذاتی طور پر یونٹ کمانڈر سے ملے۔ اس خاندان کی عسکری خدمات اور نائیک جاوید کی اچھی رپورٹ کے باعث اس وعدے پر ایک ہفتے کی چھٹی مل گئی کہ اس دوران ان کی یونٹ کو Move کرنے کا حکم ملا تو نائیک جاوید کو فوری طور پر یونٹ رپورٹ کرنا ہو گی۔

جس دن نائیک جاوید گھر پہنچا تو اسی روز شادی کی رسومات شروع ہو گئیں۔ مخدوش حالات کے پیش نظر شادی کی تاریخ تین دن بعد کی مقرر کی گئی تمام تیاریاں پہلے ہی مکمل تھیں چنانچہ تین دن بعد نائیک جاوید اختر اور شازیہ پروین کی شادی ہو گئی۔ دوسرے روز دعوت ولیمہ تھی جب پوسٹ مین نے اسے ٹیلیگرام دیا۔ جس میں اسے اگلے روز فوری طور پر واپس یونٹ رپورٹ کرنے کا کہا تھا۔ یوں اپنی نویلی دلہن کے حنائی ہاتھوں کی مہک' ماں باپ بہن بھائیوں کی خوشیاں شادی بیاہ کے بعد کی تمام رسومات ادھوری چھوڑ کر اگلے روز ہی اپنی یونٹ میں حاضر ہو گیا اور حاضری کے تیسرے دن ہی انہیں کشمیر کے محاذ کی طرف پیش قدمی کا حکم مل گیا۔ نائیک جاوید اختر کے ذہن

میں تصورات وخیالات کی ایک فلم چل رہی تھی۔تصور میں وہ اپنے آپ کو عجلہء عروسی میں دیکھ رہا تھا۔ جہاں سرخ عروسی لباس میں سمٹی سمٹائی شازیہ پروین شرم وحیا کے بوجھ تلے پلکوں کی جھالر آنکھوں پر گرائے بیٹھی تھی اور وہ اس کے حنائی اور نرم ونازک ہاتھ تھامے اس سے زندگی بھر کے عہد و پیمان باندھ رہا تھا۔ اچانک ایک کھٹکے سے نائیک جاوید اختر کے رومان پرور خیالات و تصورات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔اس نے پوزیشن لیتے ہوئے اس طرف نظریں جما دیں۔جس طرف کھٹکا ہوا تھا۔بمشکل ایک منٹ بھی نہ گزرا ہوگا کہ اس کی آنکھوں نے دور دشمن کے ایک دستے کو حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔اس کی عسکری ٹریننگ نے اسے خطرے کا ادراک کرا دیا۔اس نے فوری طور پر قریبی مورچے میں اپنے کمانڈر کو اطلاع کی اور تیزی سے اپنی پوزیشن پر واپس پہنچ کر اپنے کمانڈر کی ہدایات کا انتظار کرنے لگا۔اس کی نظریں بدستور دشمن پر جمی ہوئی تھیں اور سٹین گن شانے سے اتر کر ہاتھوں میں فائر کی پوزیشن میں آگئی تھی تاکہ خطرے کی صورت میں فوری طور پر کارروائی کی جاسکے۔

نائیک جاوید کی اطلاع پر کمانڈر نے فوری طور پر ہیڈکوارٹر سے ہدایات لیں اور انتہائی مختصر وقت میں اپنے دستے کو اس طرح ترتیب دیا کہ دشمن کے حملے کو نہ صرف روکا جاسکے بلکہ فوری طور پر اسے کچلا بھی جاسکے۔ یہ پاک فوج کا انتہائی تربیت یافتہ لڑاکا دستہ تھا۔جو موسم سرما کی کپکپا دینے والی اور ہڈیوں میں گودا جما دینے والی سردی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انتہائی مختصر وقت میں دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لئے تیار ہوگیا تھا کہ ان کے عزائم اور حوصلے کشمیر کے سربفلک پہاڑوں سے بھی زیادہ بلند و بالا تھے۔

دستے کا نوجوان کمانڈر کیپٹن عباس علی اپنے شکار پر گھات لگائے ہوئے چیتے کی طرح دشمن پر نظریں جمائے ہوئے بے چینی سے اس کی نقل وحرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔اس نے اپنے دستے کی یوں ترتیب دی تھی کہ دشمن کو اس کی کم نفری کا احساس نہ ہو سکے۔مگر وہ سب جانتے تھے کہ سرحدوں سے میلوں دوران کے دیس کے باسی محض ان کے آسرے اور اللہ کے آسرے پر بند

کمروں میں گرم گرم لحافوں میں دبکے سکھ چین اور آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ان کو علم ہے کہ سرحدوں کے رکھوالے موسموں کی سختیوں سے بے نیاز پتھریلے اور سنگلاخ پہاڑوں پر کھلے آسمان تلے اپنے گھر والوں، اپنے پیاروں سے کوسوں دور ان کی حفاظت کے لئے جاگ رہے ہیں اور چاق چوبند ہیں۔جب دشمن کیپٹن عباس علی کی گھات میں آگیا تو اس نوجوان کمانڈر نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور دشمن پر مشین گن کا برسٹ مار کر گویا حملے کا سگنل دے دیا۔کشمیر کی وادی اس دستے کے اللہ اکبر کے جوابی نعرے سے گونج اٹھی۔ساتھ ہی پوری فضا آتش و آہن سے گونج اٹھی۔دشمن شاید اس توقع پر رات کے ان سنسان لمحوں میں حملہ آور ہوا تھا۔کہ اس شدید سردی میں پاکستانی فوج اتنی چوکس نہیں ہوگی۔اس لئے وہ آسانی سے سرحد عبور کر کے پاکستان کی اہم دفاعی چوکیوں پر قبضہ کر لے گا۔مگر پاکستانی فوج کے اس مختصر سے دستے نے ان کی عددی قوت اور بہترین ہتھیاروں کے غرور کو آن واحد میں خاک میں ملا دیا۔پوری وادی ہلکے اور بھاری ہتھیاروں کے فائر کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ زخمیوں کی چیخوں اور آتش و آہن نے فضا کو آسیب زدہ بنا دیا تھا۔پاکستانی دستہ جگہیں بدل بدل کر انتہائی تیزی اور پھرتی سے فائرنگ کر رہا تھا تا کہ دشمن کو ان کی کم نفری ہونے کا احساس نہ ہو سکے۔ اس کوشش میں وہ زخمی اور شہید ہو رہے تھے۔نائیک جاوید اختر کو تین گولیاں لگی تھیں۔مگر وہ انتہائی بے جگری سے لڑ رہا تھا۔خود نوجوان کیپٹن عباس علی شدید زخمی ہو چکا تھا۔مگر وہ آخری گولی اور آخری سپاہی تک لڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔اس کے ساتھی بھی انتہائی بہادری سے دشمن کے لئے لوہے کے چنے ثابت ہو رہے تھے۔عین اسی لمحے کہ جب دشمن اپنی عددی نفری اور کارگر ہتھیاروں کی بدولت غلبہ پانا چاہتا تھا کہ ہیڈ کوارٹر سے مدد آن پہنچی۔فضا ایک بار پھر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔کیپٹن عباس علی شاید اسی مدد کا منتظر تھا۔اس نے مسکرا کر کشمیر کے سربفلک اور سینہ تانے ہوئے پہاڑوں کی طرف دیکھا۔انگلیوں سے ہوائی بوسہ اچھالا اور زخموں سے چور چور ارضِ وطن کا یہ بانکا سجیلا نوجوان کیپٹن عباس علی راہ حق کا وہ مسافر بن گیا جن کی منزلیں کہکشاؤں کے اس پار نیلے جاودانی آسمان سے پرے ہوا کرتی ہیں۔

نائیک جاوید اختر کا جسم زخموں سے چور ہو چکا تھا۔ اس کے جسم سے تازہ تازہ ابلتا ہوا لہو کشمیر کی دھرتی کو گل رنگ کر رہا تھا۔ اس کے پاس گولیاں بہت کم مقدار میں رہ گئی تھیں' مارے نقاہت کے آنکھیں بند ہوئے جا رہی تھیں۔ مگر پوری قوتِ ارادی سے دشمن کے مقابلے میں ڈٹا ہوا تھا۔ اس نے بند ہوتی آنکھوں سے تازہ کمک دیکھ لی تھی۔ نعرہ تکبیر اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بھی سن لئے تھے۔ اس کے لئے یہ احساس انتہائی جانفزا ثابت ہوا تھا کہ اس دیس کے رکھوالے دشمن کو کچلنے آن پہنچے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی دم توڑتی ہوئی ہمت کو پوری قوت سے یکجا کیا۔ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور بچی کھچی گولیوں کا پورا برسٹ دشمن کی طرف کر کے مارا۔ وہ ایک ماہر نشانچی تھا۔ زندگی بھر بہترین نشانچی کے اعزازات جیتتا رہا۔ اس آخری وقت میں بھی یہ اعزاز برقرار رہا۔ اس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے فائر کی گئی کوئی بھی گولی ضائع نہ ہوئی اور اپنے سامنے آئے ہوئے عدو کے جسموں میں پیوست ہوتی چلی گئیں۔ بعض کے جسم میں تو دو دو تین تین گولیاں بھی لگیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمت دم توڑ گئی اور وہ بے سدھ ہو کر اپنے گھر سے سیکڑوں میل دور کشمیر کے پتھریلے اور برف پوش پہاڑوں کے دامن میں واقع ایک پتھریلی چٹان پر چت لیٹ گیا۔ میری دھرتی' میری سرزمین' اس نے ڈوبتی ہوئی سانسوں اور بجھی ہوئی آنکھوں سے بمشکل بولتے ہوئے کہا' تو گواہ رہنا کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تیری حرمت کے لئے اپنے لہو سے سرزمین پر وہ چراغ روشن کئے ہیں جنہیں دنیا کی کوئی طاقت بجھا نہ پائے گی۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ اس آخری وقت میں اس نے رات کے اندھیرے میں ہی اپنے گھر کی طرف رخ کر کے اپنے ماں باپ اپنی نویلی دلہن کو سلام کیا اور پھر کلمہ شہادت پڑھ کر اپنی جاں جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

علی الصبح جب کشمیر کے سر بفلک برف پوش اور سینہ تانے ہوئے پہاڑوں سے سورج نے جھانکا تو کشمیر کے بارڈر پر پاکستانی پوسٹ پر سبز ہلالی پرچم پوری شان و شوکت سے لہرا رہا تھا۔ جبکہ نیچے وادیٔ کشمیر میں چٹانوں پر' مرغزاروں پر' دشمن کی ان گنت لاشیں دشمن کی شکست فاش کی گواہی

دے رہی تھیں۔ کہیں کہیں شہدائے وطن کے لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کسی کے چہرے پر بھی موت کی اذیت یا خوف نہ تھا بلکہ ایک سکون ایک تبسم تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے رات بھر ڈیوٹی دینے کے بعد وہ تھک ہار کر آرام کر رہے ہوں' خود نائیک جاوید اختر کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ جسم کا سارا لہو جسم سے نکل کر ان سنگلاخ چٹانوں کو رنگیں بنا چکا تھا۔ جہاں وہ لڑ رہا تھا مگر اس کا چہرہ معجزاتی طور پر بالکل محفوظ تھا۔ اس جواں چہرے پر ایک ملکوتی مسکراہٹ اور ہونٹوں پر جاودانی تبسم تھا۔ نائیک جاوید اختر کے والدین بوڑھے ہو چکے ہیں مگر آج بھی بیٹے کی یادوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ شازیہ پروین نے خاندان والوں کے زور دینے کے باوجود ابھی تک شادی نہیں کی۔ وہ بڑے فخر سے کہتی ہے کہ میں ایک شہید کی بیوہ ہوں اور شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ پھر بھلا میں دوسری شادی کیسے کر سکتی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔

لہو سے جبین وطن کو نکھارنے والے

میجر ندیم عباس بھٹی شہید کے حوالے سے سکواڈرن لیڈرز اہد یعقوب عامر کی تحریر

پاکستان کی تاریخ میں جہاں بہت سی کامیابیاں اس کا حصہ ہیں وہیں متعدد تکلیف دہ لمحات بھی ہماری ہی تاریخ ہیں" گلوبل وار آن ٹیرر" سے لے کر آرمی پبلک سکول تک، آپریشن راہ نجات ہو یا راہ راست، ضرب عضب ہو یا ایل او سی، شوال، تیرہ، وزیرستان و بلوچستان ہر جگہ ہمارے ہزاروں جوان پاکستان کے امن کی راہ میں کام آئے۔ ہر روز کسی اخبار کے کونے میں ایک دو کالمی خبر یہ نوحہ کرتی ہے کہ دہشت گردوں کے ساتھ مقابلے میں تین، چار، پانچ سیکورٹی اہلکار شہید ہو گئے۔ ٹیلی ویژن کی سکرین پر ہند سے جگمگاتے ہیں کہ وطنِ عزیز پر چار جوان اپنی جان وار گئے۔ دیکھنے والے چند لمحوں بعد چینل تبدیل کر دیتے ہیں۔ پڑھنے والے اخبار لپیٹ کر کسی کونے میں رکھ دیتے ہیں۔ اگلے ہی لمحے وہ اخبار ایک ردی کاغذ کا روپ دھار لیتا ہے۔

مگر، کیا اس طرح ہونے سے کبھی قربانیوں کا سلسلہ بھی رکا؟

ہرگز نہیں۔۔۔ سیکڑوں ہزاروں جوان ہر نئے دن کے ساتھ اس وطنِ عزیز کی سرحدوں کی اپنے لہو سے آبیاری کرتے ہیں۔ ایک لمحے کو بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے کہ ہم اپنے پیاروں کو گھر چھوڑ کر آئے ہیں۔ ان کی آنکھیں منتظر ہوں گی کہ وہ اپنا کام ختم کر کے واپس لوٹ رہا ہو گا۔ یہ سب جوان پیسے اور مراتب کے لئے یہ راہ نہیں چُنتے ان کا مقصد حیات کچھ اور ہوتا ہے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ فوج کی زندگی بالعموم متوسط طبقہ کے لوگ بخوشی جوائن کرتے ہیں۔ یہ تاثر بھی عام ہے کہ فوج میں نوکری سے جہاں طاقت اور رعب کا احساس ہوتا ہے وہیں خوشحال زندگی بھی میسر آتی ہے۔ چند روز قبل بلوچستان میں پانچ جوانوں کے ہمراہ شہادت پانے والے میجر ندیم عباس بھٹی شہید کو اگر خوشحال

زندگی کا حصول مقصود ہوتا تو وہ اپنے سیاسی خاندان کی طرح سیاست کا حصہ بنتے۔ان کے چچا مہدی حسن بھٹی متعدد بار ایم پی اے اور ایم این اے رہے۔ان کے والد محترم نذر عباس بھٹی بھی ایم پی اے رہے۔دوسرے چچا لیاقت عباس بھٹی ایم این اے اور وفاقی وزیر رہے۔میجر ندیم نے جب فوج کی مشکل زندگی کو چنا تو سگے بھائی ضلع ناظم حافظ آباد تھے۔سگے چچا زاد شوکت علی بھٹی پنجاب کے منسٹر تھے۔۔۔جو کہ اب بھی ایم این اے ہیں۔

میجر ندیم عباس سچے سپاہی اور پاکستانی تھے۔انہوں نے مشکل زندگی، مشکل محاذ اور مشکل یونٹوں میں زندگی گزار کر وطنِ عزیز پر اپنی جان نثار دی۔

میجر ندیم عباس میرے قریبی گاؤں برج دارا سے ہیں۔ان کے بھائی مبشر عباس بھٹی میرے دوستوں میں سے ہیں۔ہزاروں ایکڑ زرعی اراضی اور خوشحال زندگی۔۔مگر میجر ندیم (شہید) کو یہ زندگی ایک نظر نہ بھائی۔۔وہ ان تمام آسائشوں سے کنارہ کشی کر کے اپنی حقیقی زندگی کی طرف لوٹ گئے۔روزے کی حالت میں وہ پاک ایران سرحد کے قریب بلوچستان لبریشن آرمی کی طرف سے بچھائی گئی IED کے سبب شہادت کا مرتبہ پا گئے۔

میجر ندیم عباس بھٹی اپنے پانچ ساتھیوں سمیت بلوچستان کے ضلع کیچ کے علاقے بلیدہ میں دہشتگردی کے خلاف لڑی جانیوالی جنگ ,بلوچستان کے امن اور پاکستان کی بقا کے ضامن منصوبہ سی پیک، سرحد پر لگائے جانے والی باڑ اور 'وطن کی حفاظت کے لئے جہاں بھی جانے کا حکم ملا، والا عہد نبھا رہے تھے۔آپ اپنے گھر سے سترہ سو کلو میٹر دور روزے کی حالت میں جامِ شہادت نوش کر گئے۔

آئی ایس پی آر کے مطابق فرنٹیئر کور (ایف سی) جنوبی کی گاڑی کو اس وقت دہشگردوں نے نشانہ بنایا جب وہ پاک ایران سرحد سے چودہ کلو میٹر دور بلیدہ سے پٹرولنگ کر کے واپس آ رہی تھی۔میجر ندیم عباس (شہید) 126 ونگ مکران سکاؤٹ میں تعینات تھے اور بلوچستان میں دشمنانِ وطن کی طرف سے بچھائی گئی بارودی سرنگ کا نشانہ بن گئے۔

میں غم میں ڈوبا، خاموش بیٹھا یہی سوچ رہا ہوں۔ تمام شہید ہونے والے جوانوں کی شہادت پر دل افسردہ بھی ہے۔ مگر یہ امر قابل فخر بھی ہے کہ اربوں روپے کی جائیدادیں، وسائل، سیاسی بیک گراؤنڈ کے حامل یہ لوگ اگر ان چٹیل پہاڑوں اور ریگستانوں میں وطن کے دفاع کے لئے اپنے بازو وا کئے موت کو گلے لگاتے ہیں تو ان کی سب سے بڑی طاقت وطنیت اور قومیت ہے۔ یہ ایک واضح پیغام ہے کہ یہ وطن صرف پاکستانیوں کا ہے۔ پاکستان کا ہر طبقہ اس کے امن اور سلامتی کی راہ میں اپنے بچے وار کر اس کا حقیقی وارث بنتا ہے۔ اس کے امن سے کھیلنے والوں کو ہر موڑ پر ایک نئی داستانِ شجاعت ملے گی۔ یہاں کسی سازشی ٹولے کی نہیں چلے گی۔ بھارتی و اسرائیلی فنڈز پر پلنے والوں کو میجر ندیم شہید جیسے جوان ہر پہاڑ، ہر ریگستان، جنگل بیابان میں ملیں گے۔ ان کا استقبال اپنے منفرد انداز میں کریں گے اور ان کو رخصت اس سے بھی منفرد طریقے سے کریں گے۔ اُنہیں چُن چُن کر ان کے انجام کو پہنچائیں گے۔

میجر ندیم عباس شہید کی والدہ محترمہ کو جب ان کی شہادت کی بابت معلوم ہوا تو بہت دیر تک خاموش رہیں۔ سیاسی خاندانوں کی خواتین کے لئے اچانک موت، سانحات، فائرنگ زندگی کا حصہ تصور ہوتی ہے۔ انہوں نے بہت سی اچانک رونما ہوتی خبریں سنی ہوتی ہیں۔ مگر ندیم شہید ان کا لاڈلا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے لئے پریشان رہتی تھیں۔ وہ مشکل زندگی کا انتخاب کر چکا تھا، ضلع ناظم بیٹے، ایم این اے بھتیجوں کے مقابلے میں ندیم ہمیشہ ان کی سوچوں کا محور رہتا تھا۔ طویل خاموشی اور وقفے کے بعد والدہ کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ میرا ندیم میرا بہادر بیٹا تھا۔ مجھے اپنے شیر پر فخر ہے۔ مجھے بہادر بیٹے پر فخر ہے۔

مہدی حسن بھٹی، متعدد بار ایم این اے اور ایم اپی اے رہ چکے ہیں۔ سیاسی زندگی چار دہائیوں پر محیط ہے۔ انہوں نے میجر ندیم کی شہادت پر لکھا کہ

''وطن کی مٹی گواہ رہنا، میں نے چاند سا بیٹا تجھ پر قربان کیا ہے۔''

شہید کے بھائی مبشر عباس بھٹی جہاں اپنے بھائی کی شہادت پر افسردہ ہیں وہیں نازاں

بھی ہیں۔انہیں ہمیشہ فکر رہتی کہ ندیم کے پاس کسی چیز کی کمی نہ ہو۔فوجی زندگی کی مشکلوں میں وہ ندیم شہید کے لئے متفکر ہوتے تو رابطہ کرتے۔ہمیشہ یہی جواب ملتا،''بھائی جی فکر نہ کیا کرو''۔

وہ کبھی اپنی کسی مشکل کا اظہار اُن سے نہیں کرتے تھے۔اِس مقصد کے اظہار کے لئے اپنے چچا مہدی حسن بھٹی کا سہارا لیتے۔آج انہیں بیٹوں جیسے بھتیجے کے جانے کا دکھ ہے مگر اس کی بہادری اور ملک وملت کے وقار کے لئے دی گئی قربانی انمول ہے۔

شہید کے بیٹے یحییٰ اپنے باپ کی قبر پر جانے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔چھوٹے سے گاؤں برج دارا کے اطراف اپنی سیکڑوں ایکڑ زمین کے وسط میں میجر ندیم عباس اپنے والد صاحب کے پہلو میں دفن ہیں۔ان کا بیٹا یحییٰ دن میں متعدد بار اپنے والد سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے،اصرار کرتا ہے،گھر کا کوئی فرد اسے لے کر میجر ندیم کی قبر پر جاتا ہے۔یہ معصوم بچہ زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔والد سے باتیں کرتا ہے،سوال کرتا ہے،خواہشات دہراتا ہے،ان کے جلد واپس آنے پر مُصر ہوتا ہے۔یقین مانیں بہت سے شہداء کے بچے اسی طرح جانے والوں کو پکارتے ہیں،ان کے لئے تڑپتے ہیں،ان کے واپس آنے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔جیسے یحییٰ تڑپتا ہے ویسے ہی تڑپتے ہیں۔کبھی ان کی شرٹ کا تکیہ بنا کر اس پر کومبیٹ ڈریس کا نیم ٹیگ لگا کر اس سے لپٹ کر سوتے ہیں تو کبھی فادرز ڈے پر شہید والد کو تحائف وخطوط بھجواتے ہیں۔جوان بیوائیں یومِ والدین،رزلٹ ڈے،پیرنٹ ٹیچر میٹنگ بچوں کی گریجویشن،سالگرہ،شادیاں اکیلے سرانجام دیتی ہیں تو اس وقت ان کے آنسو کوئی نہیں دیکھ پاتا۔کاش ان آنسوؤں کی زبان ہوتی تو سب کو معلوم ہوتا کہ جانے والوں کی کمی کیا معنی رکھتی ہے۔گزشتہ چند سالوں میں قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں میں بنی نئی قبروں میں سوئے جوان اس ملک کے لئے اپنے لہو سے جبینِ وطن کو نکھار گئے۔ان کے اہلِ خانہ کے حوصلوں کی رفعت کو سلامِ عقیدت۔

تیرے بیٹے تیرے جانباز چلے آتے ہیں

میجر محمد سعود علی

پاکستان رینجرز اپنی دلیری، بہادری، فرض شناسی، پیشہ وارانہ صلاحیتوں اور قربانی کے جذبے کی وجہ سے منفرد و ممتاز ہے۔ زمانہء امن ہو یا جنگ اس کے نظم وضبط اور بلند حوصلے کی مثال نہیں ملتی۔ پاکستان رینجرز کا ہر سپاہی ملکی سلامتی اور بقاء کے لیے سب سے پہلے "دائما سا حراً" دکھائی دیتا ہے۔ طوفان ہو یا زلزلہ، سیلاب ہو یا آندھی پاکستان رینجرز ہر آفت کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔

نہایت مشکل اور کٹھن حالات میں بھی ہمت نہ ہارنا بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وطن عزیز کی حفاظت کے لیے سیسہ پلائی دیوار بن جانا پاکستان رینجرز کے نوجوانوں کا نصب العین ہے۔ وطن کے یہ بہادر جوان صحراؤں، میدانوں، کوہستانوں اور پہاڑوں میں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے ہر وقت تیار، خنداں وشاداں نظر آتے ہیں ملکی سالمیت اور استحکام کے لیے اپنی کسی بھی آسائش کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے نبھاتے ہیں۔ پاکستان رینجرز پنجاب کا کردار آسمان پر چمکتے ستاروں کی مانند ہے آپریشن راہِ نجات ہو یا آپریشن ضربِ عضب افواجِ پاکستان کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپریشن رد الفساد میں پاکستان رینجرز (پنجاب) کے بہادر جوانوں نے جرأت و بہادری کی جو قندیلیں روشن کی ہیں وہ قیامت تک جگمگاتی رہیں گی۔

شہداء آپریشن رد الفساد

آپریشن رد الفساد میں پاکستان رینجرز پنجاب کے 5 جوانوں نے اپنی جانیں ملک پر نچھاور

کیں۔آپریشن ردالفساد کا پہلا شہید سپاہی کامران افضال جس نے پاکستان کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ اس نعرے کے ساتھ دیا کہ جب تک ہم زندہ ہیں کوئی دہشت گرد ہمارے ملک کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔سپاہی کامران افضال جرأت اور بہادری کا ایک ایسا پہاڑ تھے جس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔

اے پاک وطن میلی نظر تجھ پہ جو ڈالے
اُس شخص کو کردوں میں جہنم کے حوالے
دشمن کے لئے موت کے نیزے کی چھبن ہوں
میں حیدری شمشیر ہوں اوسان شِکن ہوں

14اپریل 2017 کو راجن پور کے علاقے میں ایک مشہور زمانہ دہشت گرد اصغر دادوانی کو پکڑنے کے لیے انٹیلی جینس بیسڈ آپریشن کیا گیا۔سپاہی کامران افضال نے جرأت و بہادری کا مظاہرہ کیا اور دہشت گردوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بنے رہے متعدد دشمنوں کو جہنم واصل کیا اور اُن کی جوابی فائرنگ سے جامِ شہادت نوش کیا۔شہید سپاہی کامران افضال کے چھوٹے بھائی عدنان افضال نے بتایا کہ کامران کی شادی کو صرف 28دن ہوئے تھے۔شادی پر انہوں نے 10دن رخصت لی تھی مگر شادی کے دو دن بعد ہی ڈیوٹی پر پہنچ گئے۔کیونکہ وطن پر آزمائش کی مشکل گھڑی تھی اور اُن کے کانوں میں شہادت کی اذان گونج رہی تھی۔حکومتِ پاکستان نے سپاہی کامران کی جرأت و بہادری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ستارہ بسالت سے نوازا۔

سپاہی کامران کی شہادت نے ہمارے جوانوں کے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کیا یوں دہشت گردوں کے مذموم ارادوں کو خاک میں ملانے کے لیے حوالدار آصف اقبال ایک نئے عزم کے ساتھ اس میدان میں اُترے،دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوئے اور دہشت گردوں پر برق بن کر گرے اور فائرنگ کے تبادلے میں شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔حوالدار آصف اقبال شہید کے بھائی منظور حسین نے بتایا کہ آصف دو چیزیں برداشت نہیں کر سکتے تھے ایک والدین

کی آنکھوں میں آنسو اور دوسری وطن کے خلاف کوئی بات۔ایک طرف جذبۂ حبُ الوطنی اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا تو دوسری جانب والدین کا احترام۔والدین سے محبت کا یہ عالم تھا کہ اُنہوں نے زمانۂ طالبِ علمی میں ہی محنت مزدوری شروع کر دی تھی تا کہ والدین پر بوجھ نہ بنیں اور ملک سے محبت کا ثبوت انہوں نے وطن کی راہ میں جامِ شہادت نوش کر کے دیا۔حکومتِ پاکستان نے حوالدار آصف اقبال کی جرأت و بہادری کو مدنظر رکھتے ہوئے تمغۂ بسالت سے نوازا۔

سپاہی آفتاب احمد نے دہشتگردوں کا دلیری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا متعدد دشمنوں کو منطقی انجام تک پہنچایا اور فائرنگ کے تبادلہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔سپاہی آفتاب احمد شہید کے چچا صوبیدار (ریٹائرڈ) غلام مجتبیٰ کا خیال ہے کہ ان کے شہید بھتیجے کو شہادت کی خبر غیب سے مل چکی تھی اور اس حوالے سے وہ بہت جلدی میں تھے۔شہادت سے چند روز قبل دو دن کی چھٹی پر گھر آئے تو انہوں نے اپنی ماں سے کُھلے لفظوں میں اِس کا اظہار کیا اور اپنی ماں کو صبر کی تلقین کی اپنے دو روزہ قیام کے دوران وہ سب سے ملنا چاہتے تھے مگر شہادت کی آرزو نے اُنہیں اس قدر بے چین کر رکھا تھا کہ نمازِ فجر سے قبل ہی گھر سے روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گئے تھے حالانکہ معمول کے مطابق وہ بعد از نماز روانہ ہوتے تھے۔حکومتِ پاکستان نے سپاہی آفتاب احمد کی جرأت و بہادری کو مدنظر رکھتے ہوئے ستارۂ بسالت سے نوازا۔

وطن کی مٹی مہک اُٹھی ہے مرے شہیدو، تمہارے خوں سے
بہار گلشن میں آچکی ہے مرے شہیدو، تمہارے خوں سے
سلام تم پر، تمہارے خوں پر، تمہاری ہمت شجاعتوں پر
کہ قوم یہ سرخرو ہوئی ہے مرے شہیدو، تمہارے خوں سے

سپاہی محمد تنویر بھی جذبۂ حبُ الوطنی میں سرشار ہو کر میدان میں اُترے اور شدید فائرنگ کے باوجود ثابت قدمی سے آگے بڑھتے رہے اور دہشت گردوں کی فائرنگ کی زد میں آ کر شہادت کے رتبے پر فائز ہو گئے۔سپاہی محمد تنویر کے ماموں صوبیدار (ریٹائرڈ) محمد اسلم کے مطابق شہید بچپن سے ہی کچھ

کر گزرنے کے خواہش مند تھے۔ دراصل اُن کے اسی جوش و جذبہ نے اُنہیں رینجرز جوائن کرنے پر مجبور کیا اور پھر آخر کار ایک دن کچھ کر گزرنے کا وقت آیا تو وہ کر گزرے اور سرخرو ہو گئے۔ حکومتِ پاکستان نے سپاہی محمد تنویر کی جرأت و بہادری کو مدنظر رکھتے ہوئے تمغۂ بسالت سے نوازا۔

سپاہی عزیز اللہ نے بھی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے متعدد دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچایا فائرنگ کے تصادم میں اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کی۔ سپاہی عزیز اللہ کے بھائی بختیار خان نے بتایا کہ عزیز اللہ ایک عرصے سے شہادت کا پختہ عزم کئے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی والدہ محترمہ اُنہیں شادی کے لئے قائل کرنے کی کوشش کرتیں، وہ ٹال دیتے اور مُسکراتے ہوئے باادب انداز میں کہتے ''ماں جی میں نے شہید ہونا ہے میرا شادی سے کیا کام''۔ حکومتِ پاکستان نے سپاہی عزیز اللہ کی جرأت و بہادری کو مدِّنظر رکھتے ہوئے تمغۂ بسالت سے نوازا۔

آپریشن ردالفساد کے 5 جوانوں نے یکے بعد دیگرے اپنی جانوں کے نذرانے وطنِ عزیز کی خاطر پیش کیے اور اس بات کو سچ ثابت کر دیا کہ

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اُٹھا
تیرے بیٹے تیرے جانباز چلے آتے ہیں

افواجِ پاکستان کا جذبۂ قربانی ملکی استحکام اور بقاء کے لیے خوشحالی کا پیغام لیکر آئے گا۔ پنجاب رینجرز کا ایک ایک جوان اپنے ساتھیوں کی شہادت پر نازاں ہے کہ اگر جانوں کا نذرانہ دے کر مُلکی سرحدوں کے اندر سے دہشت گردی کو ختم کر کے امن کا پرچم لہرایا جاسکتا ہے تو ایسی ہزار جانیں اس وطنِ عزیز پر نچھاور کرنے کے لیے ہم ہر وقت دائماً سا حراًہیں۔

گُلِ چمن پہ پڑے گرد یہ ہے ناممکن
ہمارا خوں ہو کبھی سرد یہ ہے ناممکن
وطن اور اہلِ وطن میں لہو کا رشتہ ہے
ہمیں ہے فخر شہادت ہمارا ورثہ ہے

ہماری دیگر مطبوعات

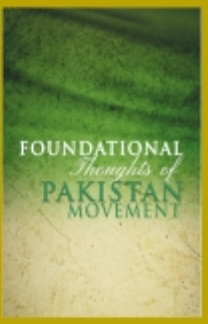

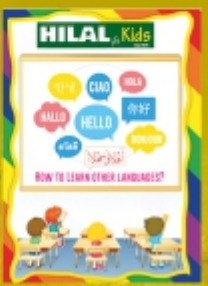

ہلال
پبلیکیشنز

انٹر سروسز پبلک ریلیشنز

ہلال روڈ راولپنڈی کینٹ، فون: 051-9272866

www.hilal.gov.pk